ماہنامہ ملکہ

چمک اُٹھے ستارے عارضوں

Urdu Photo.com

وہ صبح کاذب کا وقت تھا مشرق کی سمت آسمان پر سرخی نے ابھی پھیلنا شروع ہی کیا تھا چڑیوں کی چہچہاہٹ سے فضا بھری ہوئی تھی، لان میں ابھی تک رات کی رانی کی مہک موجود تھی انہوں نے جاگرز کے تسمے

ناولٹ

باندھے اور گیٹ کھول کر باہر سڑک پر نکل آئے۔ دور تک سنسان پڑی تھی، دور ایک دودھ والا اپنی موٹر سائیکل پہ جاتا نظر آرہا تھا۔ انہوں نے شمال کی سمت منہ کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔

ریٹائرڈ ایس پی احسن جیلانی کی ہر صبح کا آغاز اسی طرح سے ہوا کرتا تھا۔ منہ اندھیرے اٹھ کر جاگنگ کے لیے نکلنا اور قریبی پارک تک ایکسرسائز کر کے آٹھ بجے واپس لوٹنا۔ واپسی پر ودیعہ ان کی منتظر ہوا کرتی تھیں

بچے بھی ناشتے سے فارغ ہو کر کالج اور یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہوتے۔ وہ اور ودیعہ جوس لیتے، اخبار بینی کرتے پھر ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی اسٹڈی میں جا بیٹھتے۔ برسوں سے یہی ان کے معمولات تھے۔ پانچ برس ہو چکے تھے انہیں ریٹائرمنٹ لیے۔

"احسن صاحب۔ احسن صاحب!" انہیں محسوس ہوا کوئی کافی فاصلے سے انہیں پکار رہا تھا۔ رک کر ہانپتے ہوئے انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

UrduPhoto.com

وہ ایک پچاس پچپن برس کا غریب سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بکھرے بالوں اور کھچڑی داڑھی کے ساتھ وہ بڑا پریشان حال لگ رہا تھا۔ بمشکل گھسٹتا وہ ان تک پہنچا۔

"جی فرمائیے؟" انہوں نے شائستگی سے پوچھا۔

"احسن صاحب! میری مدد کیجیے۔ خدارا میری مدد کیجیے۔" اس نے ہاتھ مسلے۔

"آپ کون ہیں قبلہ۔ کیا بات ہے؟" انہوں نے قدرے نرمی سے پوچھا۔

"میں۔ میں جی۔ میرا نام حاکم ہے۔" اس نے تھوک نگلا۔ "میں چوہدری عنایت علی کا مالی ہوں۔"

واضح طور پر وہ ان سے بات کرتے ہوئے بے حد نروس معلوم ہو رہا تھا۔

"جی۔ میں واقف ہوں ان سے۔ آپ اطمینان سے بات کریں۔ بلکہ پارک قریب ہی ہے وہاں تک چلتے ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ لگتا تھا اس کے جسم کی ساری قوت و توانائی ختم ہو چکی ہے، وہ بمشکل گھسٹ رہا تھا۔

"احسن صاحب۔ میں روز صبح آپ کو اس سڑک پر دیکھتا ہوں، مجھے معلوم ہے آپ پولیس میں بڑے افسر رہ چکے ہیں۔ خدا کے بعد اب میری واحد امید آپ ہیں۔ آپ۔ آپ۔ وعدہ کریں میری مدد کریں گے۔"

دفعتاً وہ سڑک پر بیٹھ گیا اور ان کے قدموں سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگا۔

"میری ایک ہی بچی ہے احسن صاحب۔ اس کے ساتھ کچھ برا ہوا تو میں مر جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا جی۔"

"آپ۔ اٹھیے تو سہی۔" انہوں نے پریشانی سے جھک کر اس کے بازو تھامے۔ "دیکھیے مجھ سے جو بن پڑا میں کروں گا لیکن آپ اس طرح مت کیجیے۔ چلیے کہیں بیٹھ کر آرام سے اطمینان سے بات کرتے ہیں۔" وہ اسے لے کر پارک تک چلے آئے۔

"جی۔ یہاں بیٹھیے اور اب بتائیے کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے حاکم کو بنچ پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"صاحب! میں غریب آدمی ہوں۔" اس نے کاندھے پر پڑے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"حاکم نام ہے میرا اور چوہدری عنایت علی کا مالی ہوں۔ یہ دو سڑک چھوڑ کر ان کی کوٹھی ہے۔"

یہ باتیں وہ پہلے بھی بتا چکا تھا لیکن وہ اسے ٹوکے بغیر خاموشی سے سنتے رہے۔

"ایک ہی بیٹی ہے میری نسیمہ نام کی، ماں اس کی پیدائش پر ہی مر گئی تھی۔ صاحب، غریب آدمی کھانا مشکل سے ہے، علاج معالجہ کے لیے کہاں سے پیسہ لائے۔ تو جی نسیمہ کو میں نے باپ اور ماں دونوں ہی بن کر پالا ہے لیکن میری بچی۔" وہ پھر رونے لگا۔ "جانے کس حال میں ہو گی وہ۔"

"کہاں ہے وہ؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"نامعلوم صاحب کہاں ہے وہ۔ لیکن مجھے یقین ہے، اللہ کی قسم مجھے یقین ہے اسے چھوٹے بابو اور ان کے دوستوں نے ہی اٹھایا ہے۔ خدا ان بدبختوں پر اپنا [illegible] نازل کرے۔"

"[illegible] چھوٹے بابو کون ہیں؟"

"چوہدری صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے عارف صاحب۔ انہیں کی بری نگاہ تھی میری بیٹی پر۔"

"دیکھیے۔ اگر آپ اس طرح بے ربط باتیں کریں گے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔" وہ بے بسی سے بولے "مجھے ابتدا سے بتائیے۔"

"بس جی پڑھے لکھے لوگ تو ہم ہیں نہیں، جاہل ان پڑھ تو اپنے جیسی ہی بات کرتا ہے۔ اور بات تو صرف یہ ہے جی کہ میں اور نسیمہ چوہدری صاحب کے بنگلے کے پیچھے بنے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔ میں وہاں مالی کا کام کرتا تھا۔ وہ بھی اندر بنگلے میں بیگم صاحب کے چھوٹے موٹے کام نبٹا دیا کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کئی بار کہا جی، کہ وہ بنگلے میں نہیں جانا چاہتی۔ اسے اچھا نہیں لگتا۔ اور میں جاہل گنوار سمجھ ہی نہ سکا وہ غریب کیوں ایسا کہتی ہے، میں تو یہی سمجھتا رہا جی کہ سستی کی ماری ہے، کاہل ہے کام کرنا برا لگے ہے اسے۔ لیکن میں نے تو سوچا ہی نہیں کہ اپنا سارا کام جو بچی اتنی پھرتی سے، اتنے سلیقے سے

UrduPhoto.com

کرتی ہے۔ وہ دوسرے کام سے کیوں جی چُرائے گی۔ میں بھی مجبور کر کے اسے بھیجتا تھا جی تاکہ چوہدری لوگوں کو کوئی شکایت نہ ہو جائے ہم سے۔ کوئی اور در دِ چھپ کا تا ہمیں تو نہیں تھا نا جی۔ پھر جب میں نے ایک دن خود چھوٹے بالو کو اس کے منہ لگتے دیکھا تب معلوم پڑا مجھے کہ نسیمہ کیوں اندر جانے سے گھبراتی ہے۔"

وہ دم بھر کو سانس لینے کے لیے رُکا۔

"ہوں۔" احسن نے ہنکارا بھرا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"بس جی۔ پھر میں نے پابندی لگا دی اس پر۔ بڑے صاحب سے معذرت کر لی کہ نسیمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ گھر کا کام ہی مشکل سے کرتی ہے۔ اندر کا کام نہیں کر سکے گی۔ بڑے صاحب تو مان گئے پر چھوٹے بالو کا منہ بگڑ گیا۔ وہ خفا ہونے لگے۔ پھر جی۔ کوئی ہفتہ بھر پہلے انہوں نے مجھے اپنے کام سے گاؤں بھیج دیا۔ دو دن رُکنا تھا وہاں۔ میں نے جی بڑے عذر کیے۔ بہت بہانے کیے لیکن انہوں نے مجبور کر کے بھیج دیا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا جی۔ لیکن کیا کرتا، غریب آدمی تو بڑا مجبور ہوتا ہے جی۔ بڑا مجبور۔ اور جب میں گاؤں سے لوٹا تو نسیمہ نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"میں نے بڑا ڈھونڈا اسے۔ ہر جگہ تلاش کیا لیکن اسے تو لگتا ہے جیسے زمین نگل گئی ہو۔ میں نے شور مچایا، فریاد کی تو اس کا صلہ یہ ملا کہ دھکے مار کر کوٹھی سے نکال دیا گیا۔ چھوٹے بالو پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم کی سزا کے طور پر مُسٹنڈے نوکروں سے میری مار لگوائی گئی جی۔"

وہ پھر رونے لگا۔

وہ تاسف بھری نظروں سے اس بوڑھے باپ کے جھریوں بھرے چہرے کو تکتے رہے۔

"آپ بڑے آدمی ہیں احسن صاحب۔" آنسو پونچھ کر وہ ایک بار پھر گلوگیر آواز میں بولنے لگا۔ "پولیس میں بڑا نام ہے آپ کا جی۔ اگر آپ میری مدد کریں تو میں غریب آدمی تو آپ کو کچھ نہ دے سکوں گا ہاں۔ وہ خدا ضرور مہربان ہوگا آپ پر۔ ساری عمر میں اور میری بچی آپ کو دعائیں دیں گے۔ خدا آپ کو دونوں جہان میں سرخرو کرے گا۔"

وہ ساکت بیٹھے تھے۔

"دنیا آپ کی۔ کامیابیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی، انصاف آپ کا۔ ہمارا تو بس خدا رہ جاتا ہے۔ اور درحقیقت وہی اصل۔ ہمارا ہے۔"

ان کے کانوں میں گزرے ہوئے وقت کا کوئی بے درد لمحہ چلایا تھا۔ وہ ظالم یاد، وہ قاتل الفاظ کیسے بھول سکتے تھے وہ۔

"احسن صاحب!" حاکم ان کی خاموشی سے خوفزدہ ہو گیا۔ "آپ۔ آپ۔ میری مدد کریں گے نا؟"

انہوں نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ بڑی خاموش۔ بے حد بجھی ہوئی نگاہ۔

"ہاں!" پھر وہ بولے "اگر تمہاری بچی اس دنیا میں کہیں ہے۔ تو میرا تم سے وعدہ ہے میں اسے ضرور تم تک پہنچا دوں گا۔"

"احسن صاحب!" وہ نیچے بیٹھ کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ "میں زندگی بھر پاؤں دھو دھو کر پیوں گا آپ کے۔"

"ایسے مت کرو۔" انہوں نے سہولت سے اسے علیحدہ کیا۔ "میں تم پر کوئی احسان نہیں کروں گا۔ میرے اپنے سر پر اتنے قرض ہیں کہ ان کے بوجھ سے میرا سانس لینا دوبھر ہے۔ میں تو بس کسی بھی طرح، تھوڑا سا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔"

UrduPhoto.com

شوکت تھانوی کی مزاحیہ اور دلچسپ کتابیں

خود پڑھیے، دوستوں کو تحفے میں دیجیے

- مسکراہٹیں
- پہلی بیگم
- بیگی
- لاحول ولا قوۃ
- خبطی
- خوامخواہ
- مکرر ارشاد
- بہروپیا
- ہم زلف

نوٹ: /100 روپے سے زائد کے آرڈر پر 20 فیصد رعایت۔
/50 روپے سے کم مالیت کے آرڈر کا وی پی نہیں بھجوایا جاتا۔

شفیع برادرز پوسٹ بکس نمبر 586 کراچی 74200

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، لان کی سمت کھلنے والی کھڑکی سے ہلکی سی روشنی اندر آکر فرش پر ایک خاص مقام تک بچھی ہوئی تھی۔ باقی ہر جگہ اندھیرے کا راج تھا۔ راکنگ چیئر پر آگے پیچھے جھولتے ہوئے ان کا دماغ ماضی کی اتھاہ، اندھیرے غار میں ایک خاص جگہ معلق تھا۔

"دنیا آپ کی، کامیابیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی، انصاف آپ کا، ہمارا تو بس خدا رہ جاتا ہے اور درحقیقت وہی اصل سہارا ہے۔"

راکنگ چیئر کی حرکت تھم گئی اور احسن جیلانی نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ سینے پر ان کے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت ہوگئی کہ انہیں لگا، اب وہ کبھی ہاتھ کھول نہیں پائیں گے وہ ہارٹ پیشنٹ نہیں تھے، لیکن کبھی کبھی ان کا دل ان کا سینہ توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا۔ انہیں بے پناہ درد کا احساس ہوتا تھا اور ڈاکٹرز اس درد کو ان کا وہم قرار دیتے تھے۔

دریہ نے اندر آکر لائٹ جلائی، تب ان کا وجود کسی ان دیکھی گرفت سے آزاد ہوا۔ کرسی پر ایک طرف کو جھک کر وہ گہرے گہرے سانس لینے لگے۔

"احسن — احسن! کیا ہوا ہے؟"

وہ بے حد پریشانی کے عالم میں ان کا کاندھا تھام کر پوچھنے لگیں۔

"ڈاکٹر کو فون کروں؟"

"نہیں دریہ — نہیں۔" انہوں نے بے بسی سے اٹھ کر جاتی دریہ کا ہاتھ تھاما۔ "یہاں بیٹھی رہو میرے پاس۔"

"احسن!" وہ رو دینے کو ہو گئیں۔ "کرنے دیجیے فون۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"دریہ پلیز۔ مجھے تنہا چھوڑ کر مت جانا۔" انہوں نے منت کی۔

وہ پریشانی سے انہیں تکتے ہوئے ان کا سینہ سہلانے لگیں۔

"پانی پی لیں۔"

"ہاں، ٹھیک ہے پھر دو گلاس۔"

کچھ بہتر محسوس کرتے ہوئے انہوں نے سر ہلایا اور کرسی کی پشت سے لگا دیا۔

"احسن! کیا ہو جاتا ہے آپ کو؟" گلاس تھامتے ہوئے وہ بول رہی تھیں "آپ بالکل ٹھیک ٹھاک نارمل انسان ہیں۔ سارے ڈاکٹرز یہی کہتے ہیں۔ ہر ٹیسٹ رپورٹ صحیح ہوتی ہے، پھر یہ کیسا درد اٹھتا ہے آپ کو۔ اور آپ اتنی دیر تک بیڈروم میں کیوں نہیں آئے، طبیعت ٹھیک نہیں تھی، پھر بھی اسٹڈی میں بیٹھے رہے۔"

"دریہ —" انہوں نے پانی پی کر گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ "تم نے اس شخص کی چیخ و پکار نہیں سنی؟"

"سنی تھی، اس کا درد محسوس بھی کیا۔ روئی بھی لیکن پھر نارمل ہوگئی۔ دو دن گزر چکے ہیں اس واقعہ کو۔ کمال ہے آپ ریٹائرڈ ایس پی ہیں، آپ نے اتنا فیل کیا؟ آپ نے تو اپنی زندگی میں ایسے بے شمار کیسز دیکھے ہوں گے۔"

"دریہ! جب کہیں، جہاں کہیں، کسی مظلوم لڑکی کی عزت داؤ پر لگتی ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ اس کا گناہ میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔"

ان کی آواز بھر آگئی۔

"لیکن کیوں احسن کیوں؟" وہ زچ ہوگئیں۔ "آپ کا اس سارے واقعے میں کہاں کوئی قصور رہا ہے؟ آپ نے تو اس غریب کی مدد ہی کی نا۔ اس بے چارے کی زندگی اب بھی کچھ خوشگوار تو نہیں گزرے گی لیکن پھر بھی وہ اس اذیت ناک سوال کی زد میں نہیں رہے گا کہ اس کی بیٹی کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ کم از کم وہ اس کی قبر پر فاتحہ تو پڑھ سکے گا نا۔ پھر یہ خلش آپ کے دل میں کیوں رہ گئی ہے کہ اس سارے قصے میں کہیں کوئی قصور آپ کا بھی ہے۔؟"

انہوں نے ایک بے بس، بے چین نگاہ ان پر ڈالی پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

"میری خواہش تھی کہ میں اس لڑکی کی مدد کرتا۔" ہولے سے بڑبڑا کر وہ بولے۔

"جی — ہر شریف، نیک شخص ایسا ہی چاہتا ہے۔" وہ نرمی سے ان کا کاندھا دبا کر بولیں

"لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکا، تب بھی آپ بے قصور

UrduPhoto.com

[illegible]

... تھا ... [illegible] ... انتہائی ... [illegible] ... بہتر ... [illegible] ... خبر ... [illegible] ... سونے ... [illegible] ... بہت عجیب ہوں"

[illegible] بس۔"

[illegible] ... آئی ایم آل رائٹ ... شاباش ... [illegible] ... کر ... [illegible]

کبھی کبھی ... بالکل ... کی طرح ... [illegible] ... کرتے ہیں۔ ... وہ شکایتاً ... [illegible] ... اسٹڈی سے نکل گئیں۔

دروازے کے بند ہونے کے بعد انہوں نے کتابوں کے مختلف شیلف ... [illegible] ... دیکھے لیکن کوئی بھی کتاب پڑھنے کا فیصلہ نہ کر سکے ... [illegible] ... چکے تھے ... نیند بہت پہلے انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کتنی برس پہلے اور ... [illegible] ... سے وہ جاگ رہے تھے کتابیں پڑھتے تھے سوچتے تھے اور رات بیت جاتی تھی۔ اور یہ کیسا دردناک عذاب تھا۔ وہی جانتے تھے۔

اور دو دن سے وہ مسلسل جاگ رہے تھے ... [illegible] ... دردناک عذاب کا شکار تھے۔ دو دن پہلے انہوں نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے کام لے کر چوہدری عنایت کے بنگلے پر چھاپہ پڑوایا تھا۔ اور تلاشی کے دوران تہ خانے کی کچی زمین سے انسیہ کی لاش برآمد کر لی گئی تھی۔ وہ لاش، وہ بے بسی اور مجبوری کا پیکر، وہ عورت کی مظلومیت کی منہ بولتی تصویر ان کے ذہن کے پردے پر نقش ہو گئی تھی۔ ایسی ہی پچھلی کئی دوسری تصویروں کے ساتھ۔

اپنی ملازمت کے دوران ایسی کتنی ہی تصویریں وہ دیکھ چکے تھے اور ان کا ذہن ایک البم کی طرح ان

[illegible]

... زندگی ... [illegible] ... سوال ... [illegible] ... نہیں ... اس ... ایک دن ... [illegible] ... اپنے ... سامنے ... ہوگا۔

... [illegible] ... نے سگریٹ سلگائی اور ... [illegible] ... کش لینے لگے۔ ان کے اندر ایک جوار بھاٹا ... [illegible] ... ماضی، حال اور مستقبل کی لہریں ایک دوسرے ... [illegible] ... ہی رہی تھیں۔ نقش مٹ رہے تھے۔ ابھر رہے ... [illegible] ... ماضی نے سر پشتے کو نکال ... [illegible] ... سیاہ مہیب سمندر ... اندر تھا جس مارنے لگا ان کے وجود کی سرد دیوار سے ٹکرانے لگا۔ ... [illegible] ... اسٹڈی روم سے نکل کر وہ کہیں دور دراز ... [illegible] ... گاؤں میں پہنچ گئے۔

... [illegible] ... خوبصورت سرسبز گاؤں تھا۔ ٹرین وہاں صرف چند منٹ کے لیے رکتی تھی۔ اگر اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھے بڑے میاں اسے نہ جگاتے تو وہ پڑے سوتے ... [illegible] ... کہاں پہنچ جاتا۔

... [illegible] ... سفری بیگ اٹھا کر وہ چلتی ٹرین سے چھلانگ مار کر پلیٹ فارم پر کودا تھا۔

"ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" گنگناتے ہوئے اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور آگے چل دیا۔ آج سے پہلے وہ محض ایک بار یہاں آیا تھا۔ دریا خان کی شادی کے موقع پر۔ اور اب قریباً تین سال بعد وہ یہاں آیا تھا۔

پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اس نے آس پاس کے کھیتوں پر نگاہ ڈالی۔ سردیاں قریب تھیں اور فضا کہر آلود ہو رہی تھی۔ کچھ گھروں سے اوپر کو اٹھتے دھویں کے بادلوں کو وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اور تب ہی اس

UrduPhoto.com

کی نسکا ہو رہا اور تیز کی گئی ہے ان کی شان تہہ بہ تہہ ہیوں میں الجھ گئی۔

"واہ بھئی..." اس نے غصّے کی آدھ بھر کر سر ہلایا۔ "لوگ دنیا میں آ کر بیسے کیسے محل بنا ڈالتے ہیں۔ تم سے ایک زندگی کی بنیاد ٹھیک سے نہیں ڈالی جا سکی۔ احسن جمالی صاحب! آپ کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ آنیسر بننے کے خواب دیکھتے دیکھتے ٹیوشن ماسٹر بن جانا!"

چلتے چلتے جب وہ ایک شفاف رواں ندی تک جا پہنچا تب اسے احساس ہوا کہ وہ غلط سمت میں نکل آیا ہے۔

"سنو بیٹا!" اس نے وہاں کھیلتے بچوں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔ "یہ دریا خان کا مکان کہاں ہے؟"

"وہاں۔" بچے نے محض ایک سمت میں اشارہ کر دینا ہی کافی سمجھا۔

اس کی نگاہ نے اس کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا اور ناکام لوٹ آئی۔

"مجھے وہاں تک چھوڑ آؤ۔" وہ بے بسی سے بولا تھا۔

"چلو۔" وہ فوراً مان گیا۔

باقی بچوں نے بھی ان کا ساتھ دینا مناسب خیال کیا اور یوں وہ ایک قافلے کی صورت میں دریا خان کے گھر تک پہنچے۔

"مجھے یقین تھا تم آؤ گے۔"

دریا خان نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

"مجھے یقین تھا میں نہیں آؤں گا۔" وہ ہولے سے ہنسا۔ "لیکن بعض اوقات ہم فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں تو ہوتے ہیں لیکن ہمارے سامنے محض ایک ہی راہ ہوتی ہے۔"

"نکالا دیا ماموں نے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں نکالا تو نہیں لیکن رکھا بھی نہیں۔ ٹھیک ہے یار ٹھیک ہی ہے۔ اپنے گھر کے ماحول کو وہ میری وجہ سے خراب تو نہیں کر سکتے تھے نا۔ ان کی تین جوان بیٹیاں ہیں اور ماموں کو یقین ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ضرور مجھ سے سنجیدہ ہو کر اپنا مستقبل تباہ کر دے گی۔"

"اوئے تو گھبرو ہی ایسا ہے۔" دریا خان زور سے ہنسا۔ "محض گھبرو ہو کر کوئی نوجوان کسی لڑکی کو اچھا مستقبل فراہم نہیں کر سکتا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "ماموں کو میری وجاہت سے نہیں میری بے سروسامانی سے خوف تھا اگر میرے پاس ایک عدد اچھی نوکری ہوتی تو وہ خود ہاتھ سے پکڑ کر ان تینوں میں سے کسی ایک سے میری شادی جلد سے جلد کرا دیتے کہ گھر کا دیکھا بھالا لڑکا کہیں باہر نہ پھنس جائے۔"

"ٹھیک ہی ہے ہر ماں باپ اپنی بیٹیوں کا بھلا چاہتے ہیں۔"

"وہ خود کو تیری ماں کی بھی ماں سمجھ سکتی تھیں؟"

"تم بتاؤ۔" اس نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔ "نوکری مل گئی؟"

"یہ تو اب مجھے بھی خبر نہیں۔ اس کے بعد حویلی جانا نہیں ہوا تم نے آنے میں دن بھی تو لگا دیے۔ امتحان دے رہے تھے؟"

"ہوں۔" احسن نے سر ہلایا۔

"کیسا ہوا امتحان؟"

"بس یار۔ اس طرف سے بھی امید نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ امتحان اچھا نہیں ہوا۔ پیپرز شاندار دیے ہیں۔ لیکن یار ہر طرف سفارش اور رشوت کا بازار گرم ہے۔ کون ہماری قدر کو پہچانتا ہے۔"

"بہت تلخ ہو رہے ہو تم۔"

"لب پہ ہے تلخی ایام ورنہ نہیں۔" وہ ہنس دیا۔ "چلو مجھے وہاں لے چلو۔ تاکہ اس آخری امید کا بھی تصفیہ ہو جائے۔"

"نہیں آج نہیں رات اتر رہی ہے کل صبح چلیں گے۔ تم پورا دن کا سفر کر کے آئے ہو۔ ابھی کھانا کھا کر آرام کرو تاکہ دماغ سے تھکن اترے۔"

"ارے میری جان یہ برسوں کی تھکن ہے۔" وہ کھری چارپائی پر ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ "ایک رات کے آرام سے کیا خاک اترے گی۔"

دریا خان دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ تو وہ شدید تھکن کے باوجود اپنے حالات پر سوچتا رہا۔ بچپن سے وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہی رہتا تھا کہ رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا اس کے پاس نہیں تھا۔ سرکاری اسکول اور کالج میں غیر معیاری تعلیم حاصل کر کے اس نے بمشکل بی کام پاس کیا تھا، اور بنا کسی امید کے نوکری کی

تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ جو کہ تاحال اسے حاصل نہ ہو سکی تھی۔ ٹھیلہ لگانے یا جوتوں کی دکان پر بیٹھنے کو اس کا دل تیار ہی نہ ہوتا تھا کہ بچپن سے آنکھوں میں بڑا آفیسر بننے کے جو سنہرے سپنے اس نے سجائے تھے ان کے پر جلنے پر اس کا پورا وجود شدید تکلیف محسوس کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انتہائی مجبوری کے عالم میں بھی اسے کم از کم کلرک کے درجے سے نیچے نہ آنا پڑے۔

زندگی میں ایک بلند مقام حاصل کرنے کی دھن سر میں سمائی تو اس نے سی ایس ایس کی تیاری شروع کر دی۔ نوکری کی تلاش لاحاصل کو ترک کر کے وہ سارا سارا دن لائبریری میں بیٹھا رہتا۔ گھر آتا بھی تو صرف کھانا کھانے کے لیے اور یہی بات ممانی کے لیے انتہائی فکر و پریشانی کا باعث تھی کہ اس عمر کا جوان سوائے روٹیاں توڑنے اور لڑکیوں کو گھورنے کے کچھ نہیں کرتا۔ روٹیاں توڑنے والی بات ٹھیک تھی، اور اس نے بنا کسی پس و پیش کے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن دوسرا الزام برداشت کر لینا قطعاً ناممکن تھا۔ وہ اسی گھر میں پل بڑھ کر جوان ہوا تھا۔ لڑکیوں کو اس نے ہمیشہ اپنی بہنیں سمجھا تھا۔ انہیں غلط نظر سے دیکھنے کا الزام اس کے لیے ایسی تکلیف اور گھٹن کا باعث بن گیا کہ اسے اس گھر میں قدم رکھتے ہوئے بھی شرم محسوس ہونے لگی۔

انہی حالات میں اسے دریا خان کا خط موصول ہوا۔ دریا خان اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اور اس کے ساتھ اسکول اور کالج میں زیر تعلیم رہا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اپنی زمینیں سنبھالنے کی غرض سے وہ اپنے آبائی گاؤں واپس لوٹ گیا تھا اور وہیں اس نے اپنی چچازاد سے شادی کر لی تھی۔ احسن جیلانی بھی اس شادی میں شریک ہونے کے لیے آیا تھا اور تبھی احسن نے دریا خان کا گاؤں دیکھا تھا۔

دریا خان نے اپنے خط میں اسے ایک نوکری کی بابت لکھا تھا۔ اس کے گاؤں کے بڑے زمیندار کی بیٹیوں کو گھر پر تعلیم دینی تھی اور اس کے لیے اسے ایک خاصے پرکشش معاوضے کی پیشکش کی گئی تھی۔

لیکن احسن نے وہ خط پڑھ کر بے دلی سے ایک جانب ڈال دیا تھا۔ معاوضہ پرکشش ضرور تھا لیکن یہ اس کی منزل نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلندیوں کے سپنے تھے۔ فطرتاً وہ شاہین تھا۔ ذرا ذرا سے دانے کے لیے زمین پر اترنا اسے گوارا نہ تھا۔ اس نے امتحان دیا اور ایک بار پھر فٹ پاتھوں پر جوتیاں چٹخانے لگا۔ اور وہ رزلٹ آنے تک یا شاید اس کے بعد بھی یہی کرتا رہتا۔ اگر ایک رات ماموں اور ممانی کی گفتگو نہ سن لیتا۔ ممانی کا خونخوار لہجہ، تیکھے الفاظ اور ماموں کی کمزور، ٹوٹی پھوٹی مدافعتی گفتگو نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اسے کسی سے شکایت نہ تھی۔ اس گھر کی شکستہ دیواروں نے بہت عرصہ تک اسے زمانے کے سرد و گرم سے بچائے رکھا تھا۔ اور اب واقعی یہ اس کا فرض بنتا تھا کہ اس گھر کے مکینوں کی مشکلوں کو کم نہ کر سکتا ہو تو ان میں اضافہ بھی نہ کرے۔

ہر چند کہ یہ اس کا ارمان تھا کہ وہ اچھی سی نوکری ملنے کے بعد اپنی ماموں زاد بہنوں کے رشتے تلاش کرے، انہیں باعزت رخصت کرے، اور ماموں اور ممانی کی خدمت کر کے ان کے احسانوں کا بوجھ کم کرنے کی اپنی سی سعی کرے۔ لیکن اس کی اپنی قسمت اس کے ارمانوں کی کھلی مخالفت پر تلی ہوئی تھی۔ سو وہ کیا کر سکتا تھا۔

اس نے دریا خان کا خط تلاش کیا اور اپنے ایک عزیز دوست کو ساری بات بتا کر یہاں چلا آیا۔ ماموں کا خود سامنا کر کے ان کا جھکا ہوا سر اور شرمندہ نظر دیکھنے کی اسے تاب نہ تھی۔

اگلی صبح اسے چڑیوں کی بے تحاشا چہکار نے جگایا۔ آنکھیں ملتا ہوا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر صحن سے آتی آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ یہاں علی الصبح گھر کے تمام افراد جاگ کر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے، اور دریا خان کے گھر میں اس کی بیوی اور دو بہنوں کے سوائے تھا ہی کون۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور دریا خان کی ہمراہی میں حویلی کی جانب چل دیا۔ کھیت کھلیان، پگڈنڈیاں، شفاف پانی لاتی چھوٹی چھوٹی نالیاں۔ اسے ہر شے بڑی نکھری، بڑی پاکیزہ لگی۔

"یار دریا! فطرت انسان کی سب سے بڑی دوست ہے، مجھے اکثر احساس ہوتا ہے۔"

"احسن! ابا کے انتقال پر میں سوچتا تھا کہ میں شہر میں پلا بڑھا شخص کس طرح یہاں کی زندگی میں ایڈجسٹ

ہو سکوں گا۔ زمینوں میں ہل چلاتا کیسا لگوں گا۔ ایک قطعاً ان پڑھ، جاہل لڑکی سے کیسے نباہ کر پاؤں گا۔ لیکن اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ انسان بنا تو مٹی سے ہے لیکن فطرت پانی کی سی رکھتا ہے جس برتن میں ڈال دو وہی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس رنگ میں ملاؤ وہی رنگ اپنا لیتا ہے، بگڑا ہوا ہو تو سیلاب بن کر ہر شے کو تباہ کر ڈالتا ہے، اور ٹھہرا ہوا ہو تو زندگی میں دور دور تک سبزہ اگا دیتا ہے پھول کھلا دیتا ہے۔ یار گاؤں آ کر میں نے خدیجہ سے شادی کی تو مجھے پتا لگا کہ عورت عورت ہوتی ہے۔ چاہے اس کا تعلق دنیا کے کسی حصے کسی گوشے سے ہو، ایک شیشے کی بوتل جس پر آپ کسی طرح کا بھی لیبل لگا دیں۔ شہر کا یا گاؤں کا۔ بوتل شیشے کی رہتی ہے اس کی ساخت وہی رہتی ہے۔ اسی طرح عورت ایک ہے اس کی خواہشات ایک سی ہیں۔ دینے اور لینے کے بنیادی اصول ایک سے ہیں۔ میں نے کھیت میں ہل چلایا تو محسوس کیا کہ میں یہی تھا اور یہی ہوں۔ ایک کسان جو دھرتی کا سینہ پھاڑ کر اپنا رزق نکالتا ہے، لہو کا پسینہ بناتا ہے اور وہ پسینہ خاک میں ملا دیتا ہے۔ اور وہی خاک پھر سے رزق اگلتی ہے۔ یہ ایک چکر ہے اور میں ہمیشہ سے اس چکر کا ایک حصہ ہوں۔ میں نے اس سارے سیٹ اپ کو اس طرح سے قبول کیا جیسے میں ہمیشہ سے یہیں تھا جیسے میں یہاں سے کہیں گیا ہی نہیں۔ اسی طرح احسن جیلانی تم محسوس کرو گے کہ جہاں ہو اور جیسے ہو۔ تم در حقیقت یہی چاہتے تھے۔ یار انسان سنہرے سپنوں کی سنہری پری کو چھو نہیں پاتا، پکڑ نہیں پاتا تو بہت جلد اس کی آنکھیں اپنے ارد گرد بسنے والی حقیقتوں سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ یہی انسانی فطرت ہے۔ یہاں آنے سے قبل تم ضرور مایوسی اور ڈپریشن کا شکار رہے ہو گے کہ گاؤں کی زندگی میں کیسے گھل مل سکو گے لیکن آج تمہیں یہی فطرت اپنی دوست لگتی ہے۔"

وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور چلتا رہا۔ نجانے دریا خان درست کہتا تھا یا غلط۔ لیکن اس کے اپنے اندر کہیں یہ طے تھا کہ سمجھوتے ہو تو جاتے ہیں لیکن ایک ایسے بند دروازے کی مانند ہوتے ہیں جس میں سے پھر کوئی امید، کوئی خوشبو بھرا خواب انسان کے دل کے اندر نہیں جھانک پاتا۔ جیسا اس نے سوچا تھا جو کچھ اس نے چاہا تھا۔ اگر وہ بیاہ ہوتا تو وہ سمجھوتا تو کر لیتا۔ ہاں کبھی خوش نہ ہو سکتا تھا۔ اتنا وہ جانتا تھا۔ دریا خان اگر آج اپنی زندگی سے مطمئن سی تھا اور خوش بھی تو یہ بہت پہلے اس کے اندر کہیں طے ہوا ہو گا۔

"لو جی۔ آ گئی منزل۔"

دریا خان کی آواز پر وہ چونک کر خیالوں کے سمندر سے ابھرا۔ اس کے سامنے وہی عالی شان، پُر شکوہ حویلی کھڑی تھی جس کی برجیوں نے کل اس کے اندر عجیب تشنگی کے گل کھلائے تھے۔

"اندر اطلاع کرو، دریا خان ماسٹر صاحب کو لے کر آیا ہے۔" دریا خان چوکیدار سے مخاطب تھا۔

احسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"نہیں۔ یہ میری منزل نہیں ہے۔" اس کے اندر کوئی چلایا۔

"بیگم صاحب اندر بلاتی ہیں۔" چوکیدار چند منٹوں میں لوٹ آیا تھا۔

بڑا سا صحن عبور کر کے چھوٹا برآمدہ تھا جس میں تین اطراف میں راستے بنے تھے، ایک ملازم کی رہنمائی میں وہ ایک بڑے گول کمرے میں پہنچے، موٹے قالین پر چلتے ہوئے وہ گدے دار صوفے پر دھنسی لمبی چوڑی خاتون کے روبرو پہنچ گئے۔

"السلام علیکم بیگم صاحب جی!" دریا خان نے باادب سلام پیش کیا۔

احسن نے تقلید کی۔

"بیٹھو دریا خان۔" انہوں نے سلام کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ "تم بیٹھو ماسٹر!" اس نے عجیب سی تذلیل محسوس کی اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"اب آئے ہو دریا خان۔"

"بیگم صاحب۔ یہ میرا دوست اپنا امتحان دے رہا تھا اس سے فارغ ہو کر آیا ہے۔"

"ہوں۔ کتنا پڑھا ہے؟" اب روئے سخن اس کی جانب تھا۔

"جی۔ میں نے بی کام کیا ہے، اور اب سی ایس ایس کا ایگزام دے کر آیا ہوں۔"

"وہ کون سا امتحان ہے، یہ بتاؤ کتنی کلاس پڑھے ہوئے ہو۔"

اسے خاتون کی انتہا درجے کی کم علمی کا احساس ہوا۔

"جی چودہ جماعت پاس ہوں۔"

"ہوں۔ اب پندرہویں کا امتحان دیا ہے۔" انہوں نے مدبرانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

"جی!" اس نے تاسف سے محض اتنا کہنا کافی سمجھا۔

"ٹھیک ہے تعلیم تو کافی ہے لیکن۔" انہوں نے اپنے بے تحاشا جسم کی وجہ سے بمشکل پہلو بدلا۔

"لیکن کیا بیگم صاحب۔ میرا دوست بڑا قابل آدمی ہے۔"

"ہاں ہاں وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن اس کی عمر۔ حلیمہ کے بابا کوئی ادھیڑ عمر۔ یعنی میرا مطلب ہے۔"

"جی بیگم صاحب۔ میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" دریا خان نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"لیکن آپ احسن پر اتنا ہی اعتبار کر سکتی ہیں۔ جتنا کہ مجھ پر کرتی ہیں۔ اس کی شرافت کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ اصل میں یہ بے چارہ بڑا ضرورت مند ہے۔"

احسن نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"اچھا۔" بیگم صاحب کچھ کشمکش کا شکار تھیں۔

"چلو۔ ٹھیک ہے۔ کیا تنخواہ مانگتا ہے یہ؟"

"آپ جو دیں گی مناسب ہو گا۔"

احسن نے ایک نظر اسے دیکھا جواباً اس نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اچھا۔ ماسٹر تم یہیں بیٹھو میں لڑکیوں کو بھیجتی ہوں۔ دریا، اب تم جاؤ۔"

وہ بمشکل اٹھ کر اندر کسی پردے کے پیچھے گم ہو گئیں۔

"یار دریا مجھے تو مشکل لگ رہا ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ بظاہر ایسی ہیں اندر سے قطعاً خانہ خالی ہے۔ کچھ آتا جاتا نہیں، جو کہو گے آنکھ بند کر کے مان لیں گی۔ لڑکیاں بھی الو ہی ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا تو شوق ہے نہیں، وی سی آر اور ڈش دیکھ دیکھ کر فیشن سیکھ گئی ہیں۔ اب کچھ پڑھ لینے کا بھی خیال آ گیا ہے۔ بہت آسان سی جاب ہے۔"

"لیکن تم نے تو فیس وغیرہ کا بھی کچھ نہیں کہا۔"

"ارے میری جان! جلدی کیا ہے، جتنے دن یہاں نوکری کرو گے، جیب اور منہ دونوں بھرے رہیں گے۔ اس کی تم فکر مت کرو۔ اچھا میں اب چلتا ہوں تم اچھی طرح پڑھانا، پہلا دن ہے۔ اچھا امپریشن ڈالنا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"راستہ تو گھر تک کا یاد ہے نا؟"

"بھول بھی گیا تو کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤں گا۔" وہ ہنس دیا۔

"دیٹس گڈ۔"

وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نگاہ یکایک ٹھٹھک گئی۔ میرون دبیز پردوں کے پیچھے کوئی لڑکی چھپ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس بات کا بھی احساس نہ تھا کہ اس کے پیر نیچے سے دکھائی دے رہے تھے۔ چاندی کی پازیب سے سجے، سانولی رنگت کے نازک پیر۔ اس نے چند لمحے دیکھے پھر اندر آتی لڑکیوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ وہ تین لڑکیاں تھیں عمریں پچیس سے بیس کے درمیان ہوں گی۔ گہرے گہرے رنگوں کے ریشمی سوٹ پہنے، پراندے ڈالے چھم چھم کرتی وہ تینوں لائن سے اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے ایک نگاہ ان پر ڈالی۔

"جی سلام ماسٹر صاحب!" سب سے بڑی نے جواب دینے کا تکلف کیا۔

"مجھے احسن جیلانی کہتے ہیں۔ میں آج سے آپ لوگوں کو پڑھاؤں گا۔"

"پڑھائیں جی۔"

"آپ کی بکس وغیرہ۔"

"وہ تو منگوائی ہیں۔ اماں کہتی ہیں آپ نام لکھ دیں۔ کل شہر سے آ جائیں گی۔"

"اچھا۔ کون کون سے مضمون پڑھیں گی آپ لوگ۔؟"

تینوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔

"بس جی۔ پڑھنا لکھنا آ جائے۔ اردو اور انگریزی۔"

"یعنی۔" وہ ایک ثانیے کو ششدر رہ گیا۔ "آپ لوگوں نے قطعاً کچھ نہیں پڑھ رکھا؟"

"پڑھا ہوا ہوتا تو کیوں رکھتے آپ کو؟" ایک نے اعتراضاً کہا۔

UrduPhoto.com

"جی۔" اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک فرمایا آپ نے۔"

لڑکیوں کی علمی استعداد کا بخوبی اندازہ کر لینے کے بعد ابتدا اس نے الف بے اور اے بی سی سے کی۔ اور ایسا کرتے ہوئے اس کا رو دینے کو جی چاہ رہا تھا۔

تینوں کو ایک ایک صفحہ لکھنے کا کام دے کر اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی ہی تھی کہ کسی نے بڑے باادب طریقے سے چائے کی پیالی اس کے آگے کر دی۔

احسن نے چونک کر سر اٹھایا۔ سیاہ بھونرا آنکھیں ایک لمحے کو اس کی نظروں سے متصادم ہوئیں پھر ان پر پلکوں کی چلمن آ گری۔ احتراماً اس نے بھی نگاہ جھکا لی۔ اور تب وہ سانولے، نازک پیر اس کی نگاہوں کی زد میں آئے، تو یہ تھی وہ لڑکی جو اسے چھپ کر دیکھ رہی تھی۔

"شکریہ۔" کپ تھام کر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

وہ بے آواز واپس مڑ گئی۔

"سوہنی۔ پانی لا کر دے پہلے ماسٹر صاحب کو۔ کم بخت چائے کا کپ لا کر سر پہ مارتی ہے۔" تینوں میں سے ایک نے اسے آواز دی۔

"جی آپا۔" [illegible] وہ مدھم آواز میں بولی۔

احسن نے مترنم آواز سنی اور نام پر مسکرا دیا۔

"اسم بامسمّیٰ۔" اس نے سوچا تھا۔

چند لمحوں بعد پانی کا گلاس اس کے روبرو تھا۔

"جی شکریہ۔" سر اٹھائے بغیر اس نے گلاس احتیاط سے تھاما۔

واپسی پہ وہ قدرے غیر مطمئن تھا۔ لیکن اس نے دریا خان سے کچھ بھی نہ کہا۔ اور وہ کہتا بھی کیا۔ یہ کہ وہ پڑھانے تو آیا تھا لیکن الف بے یا اے بی سی نہیں۔ یہ تو ایک قطعاً غیر معقول بات ہوتی۔ پڑھانا تو اسے تھا ہی پھر اعتراض کیسا۔

چند ہی دنوں میں اسے تینوں لڑکیوں کی تمام تر قابلیت اور صلاحیتوں کا اندازہ ہو گیا۔ حلیمہ، شمیمہ اور سلیمہ نامی ہم قافیہ بہنیں، ردیف اور بحر ہر چیز میں برابر اور ہم وزن تھیں۔ ایک سے نام، ایک سی شکلیں اور ایک سے دماغ۔ مزید یہ کہ کپڑوں اور زیورات کا شوق بھی ایک سا تھا اور غالباً محض یہی ایک شوق تھا۔ پڑھنا لکھنا تو ایک مجبوری تھی کیونکہ گاؤں سے باہر کی دنیا دیکھ دیکھ کر انہیں بھی [illegible] بننے کا شوق چرایا تھا۔

"ماسٹر جی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں چھوڑیں، مجھے تو آپ سب سے پہلے انگریزی بولنا سکھا دیں۔"

ایک دن شمیمہ نے بے زاری سے رائٹنگ کا کام ایک طرف کر کے کہا تھا۔

"انگریزی بولنا سکھا دوں؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔ "یعنی ڈائریکٹ؟ بی بی! اینٹ پہ اینٹ رکھے بنا دیوار کیسے کھڑی کر لو گی؟"

"لیکن یہ کام تو بہت بڑا ہے۔ جیسا لفظ آپ بنا کر بیچے ویسے بناتے جاؤ۔ یہ بھی کوئی کام ہوا؟"

"تو پاگل نہ بنا۔ پڑھ بیٹھ کر۔" حلیمہ نے ماسٹر صاحب کی مشکل آسان کی اور چھوٹی بہن کو ڈانٹ پلائی۔ "بڑی قابل ہے۔ ماسٹر صاحب زیادہ جانتے ہیں کہ تو؟"

شمیمہ نے اسے گھورا اور کاپی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"ماسٹر صاحب! چائے۔"

احسن جو شمیمہ کی فرمائش میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی آواز پہ [illegible] اس وقت اس کی چائے آتی تھی۔ اسی آواز پہ وہ چونکتا تھا۔ اور سر اٹھائے بغیر کپ تھام لیتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی اس کا دل بے ایمانی کرتا تھا۔ اور وہ جھکے جھکے سانولے پیروں پر ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ لیکن اس سے آگے کبھی کوئی بے ایمانی کرنے کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

"سوہنی۔ کتنی بار سمجھایا ہے تجھے، پہلے پانی لایا کر۔" سلیمہ نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا تھا۔

"نہیں جی۔ بس ٹھیک ہے شکریہ۔" اس نے مداخلت کی۔ "مجھے پیاس نہیں۔"

"نہ جی ماسٹر صاحب! چائے سے پہلے پانی ضرور پیا کریں۔ گرم چائے معدہ جلاتی ہے۔ جا کر پہلے پانی سے ٹھنڈا کر لیا کریں۔" شمیمہ نے بڑے مدبرانہ انداز میں اسے سمجھایا۔ "جا سوہنی پانی لا۔"

وہ بے چارگی سے خاموش ہو گیا۔ اسے بے جا تکلیف سے بچانے کے لیے ہی اس نے پیاس نہ ہونے کا عذر پیش کیا تھا۔

UrduPhoto.com

"ماسٹر جی! پانی" بڑی مترنم آواز تھی اس کی۔ سماعتوں میں نرمیاں سی اترتی جاتی تھیں۔

"شکریہ" اس نے حسب معمول نگاہ اٹھائے بغیر پانی کا گلاس تھام لیا۔

نرم۔ میدے سے گندھی انگلیاں اس کی انگلیوں سے ٹکرائیں۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ اور نجانے کیوں نگاہ اٹھا کر اس نے دیکھا۔ وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

"اب جا۔ بھوت۔ کیوں سر پر کھڑی ہے" حلیمہ نے اسے ڈانٹا۔

وہ جلدی سے مڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

اور پہلی مرتبہ احسن جیلانی نے رات کو اپنے پلنگ پر لیٹ کر اس کے بارے میں سوچا۔

"عجیب نوکرانی ہے۔ بھلا کوئی نوکرانیاں بھی ایسی خوبصورت رکھتا ہے۔ اسے تو اس حویلی کی رانی ہونا چاہیے تھا۔ وہ چمکیلے بھڑکیلے لباس جو ان تینوں چڑیلوں پر انتہائی نامناسب معلوم ہوتے ہیں۔ وہ پہنتی تو کیسے سج جاتے۔ سچ مچ بے چاری۔ ایسی بھلی صورت اور ایسی کھوٹی قسمت۔"

پھر اس نے اس خوبصورت نوکرانی پر اپنا مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے کروٹ بدل کر سو جانا مناسب سمجھا۔

زندگی اپنی ڈگر پر یوں رواں ہوئی تھی کہ وہ خود حیران رہ گیا تھا۔

"کیا دریا خان سچ کہتا ہے؟" وہ اکثر سوچتا۔ "کیا میں بہت جلد بھول جاؤں گا کہ میرے کیا خواب تھے میں کیا چاہتا تھا، کون سی بلندیاں میرے تصورات میں تھیں۔ کیا میں اسی زندگی کو اپنا نصیب جان کر ایسے ہی نباہ دوں گا۔ لیکن کب تک؟ کب تک یہ تینوں لڑکیاں انگریزی بولنے کے شوق میں مجھ سے پڑھتی رہیں گی۔ بہت جلد انہیں اپنی شوقیہ پڑھائی سے اکتاہٹ ہونے لگے گی۔ اور ایک دن مجھے کہا جائے گا کہ میں کل سے نہ آؤں۔ پھر کیا کروں گا میں؟ کہاں جاؤں گا میں۔"

اسے اپنا آپ شدت سے بے کار اور غیر مفید محسوس ہوتا۔ اس وقت مایوسی اسے گھیر لیتی۔ کہ وہ سنجیدگی سے خودکشی کے متعلق سوچنے لگتا۔ کئی بار وہ گاؤں کو دوسرے قریبی گاؤں سے جدا کرتی اس شفاف ندی کے پاس جا کر بیٹھتا اور اس میں پاؤں لٹکا لیتا — اور سوچا کرتا کہ اس ندی کی گہرائی زیادہ سے زیادہ کیا ہو گی۔ کیا اس میں ایک چھ فٹ کا نوجوان ڈوب سکتا ہے یا نہیں۔

پھر جب سورج ڈوبنے لگتا اور آسمان کی سرخیاں ندی کے پانی کو سونے جیسی رنگت بخشتیں تو وہ اٹھتا اور تھکے ہارے قدموں سے چلتا ہوا دریا خان کے گھر کا رخ کرتا۔ دریا خان بھی عجب آدمی تھا۔ نہ اس نے کبھی اس کے آئندہ کے ارادوں کے متعلق جاننے کی کوشش کی، اور نہ حیلوں بہانوں سے اپنے گھر کا حدود اربعہ جتایا۔ یعنی اپنے متعلق وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ زندگی میں پیدا ہونے والی ہر تبدیلی کو وہ اس طرح سے قبول کرتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ ایسے ہی رہے گا۔ احسن کو اس نے بڑی کشادہ دلی سے اپنے گھر میں ہمیشہ کے لیے رکھ لیا تھا۔

لیکن احسن جیلانی، دریا خان سے الگ تھا ہر لحاظ سے الگ۔ زندگی میں پیش آنے والے نئے واقعات اسے بہت ڈسٹرب کرتے تھے۔ سو ایک عجیب اور نئے واقعہ نے اسے نہ صرف ڈسٹرب بلکہ خوف زدہ بھی کر دیا۔

اس شام نہ سلیمہ تھی نہ شمیمہ۔ وہ دونوں اپنی کسی سہیلی کی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ حلیمہ کو اکیلا دیکھ کر اس کا ہمیشہ آف رہنے والا موڈ مزید آف ہو گیا۔

"آپ ہی پڑھیں گی؟" اس نے قدرے اکتاہٹ سے پوچھا تھا۔

"جی ماسٹر صاحب" وہ مسکرائی۔ "آپ بیٹھیے نا۔"

"آپ کی بہنیں پیچھے رہ جائیں گی؟"

وہ دل سے چاہ رہا تھا کہ وہ بھی چھٹی کرے تو اس کی جان بخشی ہو جائے۔

"دفع کریں جی۔ ان کم بختوں کا کب دل لگتا ہے پڑھائی میں۔ میں ہی زبردستی کرتی ہوں ان کے ساتھ۔ میں تو جی آج بھی پڑھوں گی اور کل بھی۔"

"بہتر" وہ بیٹھ گیا۔ "کل کا کام پورا ہے آپ کا؟"

"جی۔ چیکنگ کرا دوں؟"

"کرائیے" اس نے لبوں پر آنے والی مسکراہٹ

UrduPhoto.com

کرو گے کل ریو۔

"ماسٹر جی!"

"جی۔"

پڑھنے کا انداز ... سے جرأت کر کے ایک ... آپ ... ہیں ... تعل کر ... بنا کریں! اتنا کہ ... آپ بہت بڑے اچھے لگتے ہیں۔"

اس نے ذرا سا سب سمجھ کر اور نظر جھکا لی۔

"حلیمہ بی بی! کام کیجئے۔"

اس کا ... دیکھ کر ... انگلا کام ... کر دہ اپنے ساتھ لائی ایک کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ تینوں لڑکیاں کام اتنی سستی سے کرتی تھیں کہ اسے خود کو بوریت سے بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی کتاب ساتھ رکھنی پڑتی تھی۔

"ماسٹر صاحب۔" دوبارہ پکارا گیا۔

"جی۔" اس نے نظر اٹھائی۔

"ایک بات پوچھ لوں جی۔ ناراض نہ ہوں تو؟"

"پوچھیے!" اس نے گہرا سانس خارج کیا اور کتاب بند کی۔

"یہ جی۔ محبت کیسے ہو جاتی ہے؟"

"اوہ گاڈ۔"

اس کا ... جی ... ہو گیا۔ جامنی رنگ کے دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبائے وہ بڑی لگن سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں کل آؤں گا۔" وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"سنیے جی۔ سنیے!"

وہ اس سے پہلے دروازے تک پہنچ گئی۔

"حلیمہ بی بی! کیا کر رہی ہیں آپ۔" اس نے راہ میں کھڑی اس جاہل، بینڈو لڑکی کو بے بسی سے دیکھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ "کوئی آدھر آنکلا تو۔"

"اوہو۔ کوئی نہیں آتا ماسٹر جی۔ آپ اتنے بزدل ہیں۔ میری بات تو پوری سن لیں نا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ بیٹھ کر بات کریں۔"

راستے میں کھڑے ہونا اسے اس قدر ... لگ رہا تھا کہ مجبوراً واپس بیٹھنا پڑا۔

"ماسٹر جی! آپ اتنے خوبصورت ہیں۔ میرا تو دل مل گیا ہے آپ سے۔ آپ یہ بتائیں، میں اچھی لگتی ہوں

... کرو۔

... ایک ... سب سے ... کر دیا۔

... سے ... کر دو۔

"دیکھیں بی بی۔ ... ان ... نہیں ... آپ ... ایک رشتہ ہے میرے اور آپ کے درمیان ... زیب نہیں دیتا آپ کو۔"

"دیکھو ... جی ان ... ۔ ... سو سال ... آپ نے ... رکھی ہے۔ ... دلوں کی ... "

"جی نہیں۔" اس کا خون کھولنے لگا۔ "اس میں ... پڑھتا ... ہیروئن کو۔"

اس کی بات درمیان میں تھی جب وہ ... جاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

... انہیں ... پوچھنا لگا۔ ... نے سر اٹھا کر قدرے حیرانی سے اسے دیکھا لیکن وہ اس ... ڈالے بنا کمرے فرش پر جوتوں کے نشان بناتا نکلتا چلا گیا۔

رات کو کھانے کے وقت اس نے پیٹ خراب ... بہانا کر دیا ... لیٹا ... اکیلے لیٹ کر ... آسمان کو تکتے ہوئے وہ بہت افسردہ بہت بے چین تھا۔

حیات پہلے ہی کتنی بے ثمر تھی جو اس میں مزید تلخیاں گھلتی جا رہی تھیں۔

"روپے، روپے، روپے۔" اس نے پلنگ کی ... پر مکا رسید کیا۔ "یہ روپے ہوتے ہیں جو بے زار کرتے ہیں جینے سے۔ دور کرتے ہیں خوشیوں سے، زندہ رہنے کی امنگوں سے۔ آخر انسان اپنا احتساب خود کیوں نہیں کرتے۔

وہ جاہل لڑکی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں اور اظہار محبت کرنے بیٹھ گئی اور انتہائی گھٹیا درجے کا اظہار۔ ارے کمبخت، میں پڑھانے آتا ہوں، تمہیں فیس لیتا ہوں اپنے وقت کی۔ ان دو باتوں کے درمیان یہ نیا تعلق کب اور کہاں پیدا ہوا۔ میں خوبصورت ہوں اس لیے مجھ سے محبت ہو گئی۔ ہونہہ ٹھیک کہتا تھا دریا خان۔ ڈش اور وی سی آر دیکھ دیکھ کر یہ ... ابھرا

UrduPhoto.com

"ہے ان خالی دماغوں میں؟ رومانی دلوں کی داستان!" پھر اسے یکایک زور سے ہنسی آ گئی۔

"نانا کل یا پرسوں محترمہ نے یہ فلم دیکھی ہو گی اور دفعتاً انہیں خیال آیا ہو گا کہ انہیں بھی تو ایک ہیرو پڑھانے آتا ہے۔ جسے انہوں نے اپنی زندگی کا ہیرو بنانے کا فیصلہ کر ڈالا۔" سوچتے سوچتے اسے کافی رات بیت گئی۔ اس افسانے سے وہ نہ صرف ذہنی طور پر مجروح ہوا تھا بلکہ خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی بہت عام سی سہی لیکن بہر حال ایک لڑکی تھی۔ صنف نازک۔ جو اسے خود سے بے زار پا کر کسی بھی مشکل میں بہت آسانی سے پھنسا سکتی تھی۔ اس کے ذرا سے اشارے پر حویلی کے خونخوار ملازم اس کی تکا بوٹی کر سکتے تھے۔

رات کی فضاؤں میں رچی خنکی کے باوجود اس کا وجود گرم ہونے لگا۔

اور عام تو وہ صرف اپنی شخصیت میں تھی دوسرے پہلو سے دیکھا جاتا تو وہ ایک بڑے زمیندار کی لاڈلی صاحبزادی تھی۔ احسن جیلانی کو اپنا آپ ان دیکھے پھندوں میں الجھتا نظر آیا۔ اسے احساس ہوا کہ اب اسے بڑی احتیاط سے کام لینا ہے۔ اسے دوسرے رویے سے کام لینا ہے تاکہ اس لڑکی کو نہ تو شکست کا احساس ہو اور نہ ہی وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو سکے۔ اسے علم تھا کہ زیادہ سختی سے کام لینے کا نتیجہ قدرے الٹ بھی ہو سکتا تھا اس بے شعور لڑکی سے اسے کسی قسم کی اچھی امید نہ تھی۔

"بہر حال!" کروٹ لے کر اس نے سوچا۔ "میرا دل بھی صاف ہے اور ضمیر بھی۔ خدا میری مدد کرے گا۔"

پھر اس نے آسمان پر پھیلتی سفیدیوں کو دیکھا اور تکیے میں منہ دبا کر سو گیا۔

اگلے دن اس نے کمال صفائی سے چھٹی ماری اور کہلا بھیجا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب وہ اس لڑکی کو اکیلے میں پڑھانے کا خطرہ مول لینے کو قطعاً تیار نہ تھا۔ کل اظہار عشق کیا تھا۔ آج مزید کیا کچھ کہتی، اسے خبر نہ تھی۔

اور وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی جب اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ گھڑا تھا۔ شام آنے تک وہ شدید قسم کے بخار میں مبتلا ہو گیا۔

دریا خان کی بیوی نے ایک بڑی محبت کرنے والی بہن کی طرح اس کی تیمارداری کی اور دو دن تک اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اس کا سر دباتی رہی اور دعائیں پڑھ پڑھ کر اس پر دم کرتی رہی۔

اور احسن جیلانی نے سوچا کہ دریا خان کا فیصلہ کتنا درست تھا۔ اگر وہ اس فرشتوں جیسی معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی کو محض ان پڑھ اور گنوار کی لڑکی کہہ کر چھوڑ دیتا اور اس کی ماموں زاد بہنوں جیسی کسی شہری لڑکی سے شادی کر لیتا تو اس کا یہ گھر فردوس کدہ کے بجائے جہنم کدہ لگتا۔

ٹھیک ہو جانے کے بعد نہا دھو کر اس نے سب سے پہلا کام حویلی جانے کا کیا۔ چار دن کی چھٹی کے بعد اس کے ذہن سے حلیمہ کی باتیں بھی کافی حد تک محو ہو گئی تھیں، اور اب اس کی کم عقلی پر اسے ہنسی آ رہی تھی۔

حویلی کے مرکزی گیٹ کا کھٹکا کھولا اور صحن عبور کر کے برآمدے تک جا پہنچا۔ آج ساری حویلی سونی سونی، خاموش خاموش سی لگ رہی تھی۔ سردیوں کی نرم دھوپ صحن اور آدھے برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے گول ستونوں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جن کے سرسبز پتے چمکدار اور خوشنما لگ رہے تھے۔

"ماسٹر صاحب!" کسی نے انتہائی نرمی سے پکارا تھا۔

وہ چونک کر مڑا۔ سامنے سوہنی کھڑی تھی سرخ اور سیاہ چنری کا دوپٹہ ماتھے تک اوڑھے، نظریں جھکائے وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"جی۔" اس نے ایک نگاہ اس کی پلکوں پر ڈالی۔

"کیا بات ہے؟ آج چھٹی کرنی ہے؟"

"جی۔ نہیں۔ وہ۔" اس نے چاروں جانب دیکھا۔

وہ مسکرا دیا۔

"اطمینان سے بتایئے کیا بات ہے؟"

"آپ۔ آپ۔ اندر چلیں۔" اس نے پھر بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔

وہ بے حد گھبرائی ہوئی، خوف زدہ سی لگتی تھی۔

"چلیے۔" اس کی حالت دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

وہ اسے گول کمرے میں لے آئی۔ وہ یوں بھی روز یہاں آنے کا عادی تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب کہ وہ قدرے فاصلے پر کھڑی رہی۔ جیسے اس نے کوئی بڑا گناہ کیا ہو۔

Urdu Note.com

"جی بی بی۔ کہیے۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "کیا بات ہے کیا حویلی کے لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں؟ اتنی خاموشی کیوں ہے۔"

"جی۔ وہ سب۔ بڑے چچا کی حویلی گئے ہیں پندرہ دنوں کے لیے۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔

"اچھا! لیکن کیوں؟"

"ان کے چھوٹے بیٹے کی منگنی ہو گئی ہے۔ اسی لیے سب کو اچانک ہی جانا پڑا۔"

"اوہ۔ بیچ بیچ۔ بہت افسوس ہوا سن کر لیکن آپ یہ سب مجھے باہر ہی بتا دیتیں تو بہتر تھا۔"

"ماسٹر جی۔ آپ۔ آپ۔ اتنے دن مجھے پڑھا دیں گے؟" اس نے انتہائی عاجزانہ درخواست کی تھی۔

احسن نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ کو؟" اس نے انتہائی تعجب سے پوچھا تھا۔

"لیکن کیوں۔؟"

"کیوں؟ اس لیے کہ میرا بھی پڑھنے کا دل کرتا ہے۔"

"آپ نے اپنے مالکوں سے اجازت لے لی ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"مالکوں سے؟" وہ حد درجے تعجب سے بولی تھی۔

"کون مالک [illegible]"

"میرا مطلب ہے۔ بڑی بیگم صاحب۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"ماسٹر جی، میں یہاں نوکرانی نہیں ہوں۔" وہ یکدم اس کا مطلب سمجھ گئی۔ "میں۔ میں تو ان کی سگی ماں جائی کی بیٹی ہوں۔ خالہ ہیں وہ میری۔"

"اوہ۔ کیا واقعی۔" اسے شاک لگا تھا۔ "تو پھر۔ میرا مطلب ہے اتنا فرق کیوں ہے، آپ کے رہن سہن اور آپ کی خالہ زاد بہنوں کے رہن سہن میں۔"

"اس لیے کہ شاید جو کچھ آپ نے سمجھا وہی یہ سب لوگ بھی سمجھتے ہیں۔" سوہنی نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔

"میں خالہ کی اس بہن کی بیٹی ہوں، جو ان کی طرح اتنے بڑے آدمی سے نہیں بیاہی گئی تھی، بلکہ ایک چھوٹے غریب ڈرائیور کی بیوی تھی۔ میری ماں مر گئی تو ابا نے دوسری شادی کر لی۔ خالہ مجھے سوتیلی ماں کے ظلم سے بچانے کے لیے تو یہاں لے آئی ہیں۔ لیکن۔ لیکن انہیں اپنے اور اپنی اولاد کے سلوک نظر نہیں آتے، شاید اسی لیے انہیں احساس نہیں ہوتا۔ کہ میں سب سے آخر میں بچا کھچا کھانا کھاتی ہوں۔ اور ان کی بیٹیوں کی اترن پہنتی ہوں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ مجھے اتنا کام کرتا دیکھ کر یہاں کے سارے لوگ مجھے نوکرانی سمجھتے ہیں۔" اس کی آواز رندھ گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔

"بہت افسوس ہوا مجھے یہ سب جان کر لیکن سوہنی بی بی بات صرف اتنی ہے کہ کوئی شخص تو اپنی صورت خود بنا سکتا ہے اور نہ مقدر۔ شاید آپ کو احساس نہیں ہے کہ اس طرح سوچ کر کبھی آپ ان تینوں سے علیحدہ اور منفرد لگتی ہیں۔ نہ وہ اپنی صورت آپ جیسی کر سکتی ہیں اور نہ آپ اپنا مقدر ان جیسا۔"

اس کا انداز اور اس کا لہجہ بالکل سادہ اور بے ریا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس نے انتہائی مخلصانہ جذبات سے مغلوب ہو کر کہا تھا۔

"میں نے کبھی اپنے خدا سے شکایت بھی نہیں کی۔" اس نے جلدی سے سر ہلایا اور آنکھیں صاف کر لیں۔ "سب کو اپنے اپنے حصے کا ملتا ہے۔ آپ سے تو مجھے بس اتنا کہنا تھا کہ ان پندرہ بیس دنوں میں آپ مجھے جتنا پڑھا سکتے ہیں پڑھا دیں۔ میں بالکل کوری نہیں ہوں ماسٹر صاحب۔ جو کچھ آپ نے میری بہنوں کو سکھایا ہے۔ وہ سب مجھے آتا ہے۔ میں۔ میں اکثر یہاں پردے کے پیچھے سے وہ سب سیکھتی رہتی ہوں۔ جو آپ انہیں سکھاتے ہیں چھپ کر، چوری سے ان کی کاپیاں اور کتابیں بھی پڑھتی ہوں۔ اتنا کچھ تو مجھے بھی آتا ہے۔"

وہ حیرانی سے اس کی صورت کو تک رہا تھا۔ جنہیں پڑھنے لکھنے کا شوق محض فیشن کی حد تک تھا۔ انہیں دو ہزار کی ٹیوشن کی سہولت حاصل تھی اور جس کا یہ شوق جنون کی حدوں تک جا پہنچا تھا۔ اسے پردے کے پیچھے چھپ کر چوری کا علم حاصل کرنا پڑتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کے لیے خاموش ہو گیا۔

"ماسٹر صاحب۔ آپ میرا یقین کریں جی۔ کسی کو اس بات کا علم نہیں ہو گا۔" وہ اس کی خاموشی سے مایوس ہو کر بولی۔ "ان لوگوں کے جاتے ہی سارے نوکر چاکر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے ہیں۔ اب ان کے آنے سے ایک دو دن پہلے ہی لوٹیں گے۔ صرف چوکیدار اور کھانا پکانے والی ماسی رہ گئے ہیں۔ چوکیدار کو لکنت کی بیماری ہے

hoto.com

[illegible] وقتی [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] پڑھ [illegible] [illegible] تو
[illegible] کی [illegible] [illegible] اگر
آپ [illegible] مجھے پڑھا دیں تو کسی کو کانوں
کان [illegible] نہیں ہوگی۔ مجھے پکا پتا ہے۔ میں تو پڑھی
[illegible] یہاں [illegible] ہوں ایسے میں کوئی اگر میرا
[illegible] بھی کرے۔ تو دس دن تک پتا نہ کسی کو خبر [illegible]
[illegible]

احسن نے اسے [illegible] سے دیکھا۔ [illegible] [illegible] وہ
[illegible] لئے آگاہ کر رہی تھی۔ [illegible] بغیر
کہ ماسٹر صاحب ایک جوان [illegible] تھا۔ جس کی نیت کسی بھی
لمحے بے ایمان بھی ہو سکتی تھی۔ جب کہ انہیں مکمل آزادی
[illegible] میسر تھی۔

"آخر یہ لڑکیاں اتنی معصوم کیوں ہوتی ہیں۔ ہر کسی
کو اپنا جیسا ہی سمجھ لیتی ہیں۔"
رات کو بستر پر لیٹ کر اس نے سوچا تھا۔
"کس قدر تفصیلاً اس نے مجھے ہر بات سے آگاہ کر
دیا ہے۔ آخر کون لگتا ہوں میں اس کا۔ اور کتنا مانتی
ہے وہ مجھے [illegible] لڑکی۔"
لیکن کچھ [illegible] نے [illegible]
نہ معلوم کیوں اسے دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر اس
کے بچپن کا احسن اس کے اندر سے نکل کر سامنے آ کھڑا ہوا
تھا۔ وہ احسن جسے اچھے اسکولوں میں، اچھے کالج میں
پڑھنے کا انتہائی شوق تھا۔ جسے کالج میں ٹیوشن کی انتہائی
ضرورت تھی، اور وہ دو دو ہزار کے ٹیوشن افورڈ نہیں کر
سکتا تھا اور اسی لیے اسے کسی پروفیسر نے پڑھانے کی
ہامی نہیں بھری تھی۔ وہ احسن جس کے کالج کے خواب
ٹوٹ پھوٹ کر اسی کی آنکھوں میں پیوست ہو چکے تھے، وہ
کیسے کسی کو پڑھانے سے انکار کر سکتا تھا۔

دوسرے دن وہ حویلی پہنچا اور سوہنی کی حسب ہدایت
سیدھا گول کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ وہیں موجود تھی۔ اپنی
کاپی کھولے اس کی منتظر تھی۔
"ماسٹر جی۔ آپ آ گئے۔" اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔
"میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں سمجھی تھی آپ نہیں
آئیں گے۔ بس مجھے بہلانے کو کل ہامی بھر لی تھی۔"
"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" وہ مسکرا کر اس کے

سامنے بیٹھ گیا۔ [illegible] کے [illegible]
[illegible] کو دل رکھنے کے لیے تھی [illegible] گو
توڑنے کو [illegible] نہیں سکتا۔
"آپ بہت [illegible] مجھے [illegible] ماسٹر صاحب [illegible]"
بولنے سے [illegible] کر وہ خاموش ہو گیا۔
"لائیے دکھائیے۔ کیا کیا کام کر رہا ہے۔"
اس کی کاپی لے کر وہ اس کا کام چیک کرنے لگا۔
اسی دوران کاپی پر نظریں جمائے اسے مخاطب کیا۔
"سوہنی بی بی۔ ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں
مانیں گی۔"
"آپ کی کسی بات کا میں برا نہیں مانوں گی۔ آپ
نے تو جی اتنا احسان کیا ہے مجھ پر۔ میرا اتنا بڑا شوق پورا
کر رہے ہیں۔"
"جس طرح کل آپ نے مجھے اپنی تنہائی اور اکیلے پن
کا احساس دلایا ہے ایسا کسی لڑکے کے سامنے مت کہیے گا۔
مجھے فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں ہے لیکن بہت سے لڑکوں
میں شیطان بھی چھپا ہوتا ہے اور ہم انہیں محض چہروں
سے نہیں پہچان سکتے اور لڑکیوں کو تو بہت محتاط ہونا
چاہیے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات؟"
[illegible] وہ بولی۔ "لیکن ماسٹر صاحب آپ
پر تو مجھے پکا اعتماد ہے جی۔!"
"وہ کیوں؟" آنکھیں قدرے بند کرتے ہوئے اس
نے حیرانی سے پوچھا۔
"آپ تو جی۔ آپ سے تو جی رشتہ بنتا ہے میرا۔"
وہ شرما کر بولی۔
"رشتہ۔؟" وہ حیرانی کی حدوں کو پار کر گیا۔ "کون
سا رشتہ؟"
"وہ جی۔ وہ۔ حلیمہ آپا میری بہن لگتی ہیں، تو آپ
ان کے حوالے سے میرے دولہا بھائی ہوئے نا۔"
پین انگلیوں میں دبائے وہ ساکت رہ گیا۔
پھر وہ حواسوں میں لوٹا۔ کاپی بند کی اور صوفے کی
پشت سے ٹیک لگا لی۔
"کس نے کہا یہ سب آپ سے؟" قدرے درشتی سے
اس نے پوچھا تھا۔
"مجھ سے تو کسی نے نہیں کہا۔" وہ اس کے انداز پر
گھبرا گئی۔ "قسم لے لیں۔ حلیمہ آپا نے مجھ سے بالکل نہیں

UrduPhoto.com

کہا۔

"پھر۔ یہ بے ہودہ بکواس کیوں فرمائی آپ نے!" وہ انتہائی طور پر تپ چکا تھا۔

"وہ۔ وہ تو سلیمہ آپا کو بتا رہی تھیں۔" وہ نروس ہو گئی۔ "میں۔ وہیں لیٹی تھی، انہیں خبر نہیں تھی۔ بس ایسے سن لیا میں نے۔"

"کیا فرما رہی تھیں وہ؟" دانت کچکچا کر اس نے پوچھا۔

"یہ کہ۔ آپ اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اپنا تو جی پکا پتا تھا انہیں۔ ہاں آپ کا پکا پتا نہیں تھا لیکن وہ کہہ رہی تھیں آپ انہیں بڑی میٹھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور۔ اور انہیں یقین سا ہے کہ آپ بھی ان سے۔ کرتے ہیں۔"

"کیا کرتا ہوں؟" اس نے پین کاپی پر دے مارا۔

"وہ۔" اس نے تھوک نگلا۔ "وہ۔ جی۔ محبت۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور کافی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ ایسے حالات کی سنگینی کا علم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لڑکی جلیبہ اسے کسی بھی مشکل میں پھنسا سکتی تھی۔ یہ شہر نہیں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اگر اسے یہاں کسی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑ جاتا تو دریا خان پر بھی یہاں کی زمین تنگ ہو سکتی تھی۔ اور اس کے پیارے دوست اس کے محسن پر کوئی آنچ آتی وہ جیتے جی شرمندگی سے مر جاتا۔

"کیا ہوا ماسٹر صاحب؟" سوہنی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

احسن نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"سوہنی بی بی! جو کچھ آپ نے اپنی آپا کے منہ سے سنا وہ سراسر غلط ہے۔ نہ میں اپنے دل میں ان کے لیے کوئی جذبہ رکھتا ہوں اور نہ ان کے کسی جذبے کی پذیرائی کے لیے تیار ہوں۔ میں ایک سیدھا سادا سا بندہ ہوں، کچھ دنوں کے لیے یہاں آیا ہوں، پھر جانے کہاں ہوں گا مجھے خود خبر نہیں۔ آپ کی آپا میرے لیے کتنی مشکلات کھڑی کر سکتی ہیں۔ شاید انہیں اندازہ نہیں ہے۔"

"نہیں جی۔ آپا بہت اچھی ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "بس ذرا مزاج کی تیز ہیں۔ تو کیا ہوا، اکثر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ آپ جی ان کا دل نہ توڑیں۔"

"اوہو۔ کیا بے وقوفی ہے۔" وہ جھنجلا گیا۔ "میں چلا جاتا ہوں، اور اب شاید کبھی نہ آؤں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"مم۔ ماسٹر جی۔ بات سنیں جی۔" وہ بوکھلا اٹھی۔ اور اس کا بازو تھام لیا۔

احسن اپنی جگہ رک گیا۔

"دیکھیے اگر آپ چلے گئے نا تو آپا چوکیدار کو بلا کر پوچھیں گی کہ ماسٹر صاحب کیوں نہیں آئے۔ انہیں کتنے دن کی چھٹی کا کہا تھا۔ اور چوکیدار انہیں بتا دے گا کہ اسے کچھ خبر نہیں۔ وہ تو آپ کے گھر گیا ہی نہیں۔ اور پھر میری شامت آئے گی۔ آپا نے مجھ سے ہی کہا تھا کہ میں چوکیدار کو پیغام دے کر آپ کے گھر بھیج دوں کہ پندرہ دن کی چھٹی کرنی ہے۔ دیکھیے ماسٹر صاحب! ایسے مت جائیں، خفا ہو کر، ناراض ہو کر، میں سچ کہتی ہوں مجھے بڑی مار پڑتی ہے۔ خالہ مجھے چھڑی سے مارتی ہیں۔"

اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں ہو گئی۔ وہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کا بازو سختی سے تھامے وہ اس کے قریب کھڑی ٹپ ٹپ آنسو گرا رہی تھی۔ بڑا خوبصورت منظر تھا اور احسن نے اپنی زندگی میں ایسا خوبصورت منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اپنا بازو چھڑانے کی کوئی کوشش کیے بنا وہ خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔

پھر اچانک اسے خود ہی احساس ہوا اور اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ پھر دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کو رگڑ ڈالا۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم۔ خالہ تمہیں چھڑی سے مارتی ہیں؟" اس نے ایسے پوچھا جیسے برسوں کی شناسائی رہی ہو۔

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"لیکن کیوں؟" اسے بے پناہ افسوس ہوا۔

اس پھولوں جیسی لڑکی کو تو کوئی پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ مارتا۔ کیسی سنگ دل بے حس عورت تھی اس کی خالہ۔

"بس جی!" اس کی رندھی ہوئی آواز نکلی۔ "کوئی غلطی ہو جائے تو۔"

احسن نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہیں نا" سوہنی نے اپنی سوہنی صورت اس کی جانب کر کے بڑی آس سے پوچھا۔
"نہیں" وہ نرمی سے بولا۔
"اور۔ پڑھانے آئیں گے نا۔"
"کسے؟ تمہیں یا تمہاری آپاؤں کو؟" وہ مسکرایا۔
"مجھے تو بے شک نہ آئیں پڑھانے۔ کوئی پروا نہیں" وہ جلدی سے بولی "پر انہیں پڑھانے ضرور آنا ماسٹر صاحب، ورنہ میری شامت آجائے گی۔"
"انہیں بھی پڑھانے آؤں گا اور تمہیں بھی" وہ ہنس دیا "اچھا اب چلتا ہوں۔"
وہ باہر نکلا تو دل کی کیفیت پر حیران تھا۔ ایسی حالت آج سے پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ لڑکی محض ایک لمحے میں اس کے دل کو اپنا پابند کر گئی تھی۔
"عجب دیدہ دلیری ہے" وہ حیرانی سے ہنس دیا۔
اور پھر وہ روز اسے پڑھانے جانے لگا۔ اسے خود پر بھی حیرت تھی۔ کتنی آسانی سے ہر طرح کا خوف اس کے دل سے نکل گیا تھا۔ نہ اسے کسی کے دیکھ لینے کا ڈر رہا تھا، نہ نوکری چلے جانے کا۔ اسے صرف ایک نام، ایک صورت یاد رہ گئی تھی۔ باقی ہر مسئلے کو، ہر پریشانی کو وہ بھولتا چلا جا رہا تھا۔ صبح و شام اس کا دل ایک نام الاپتا تھا۔
"سوہنی، سوہنی، سوہنی۔"
باقی ہر شے کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔
"سوہنی۔"
اسے پڑھاتے دسواں روز تھا جب اس نے اچانک اسے پکار لیا۔
"جی ماسٹر جی!"
سارے بال چہرے پر بکھرائے وہ بڑی تندہی سے رائٹنگ کر رہی تھی۔
"کچھ دن بعد تمہارے گھر والے آجائیں گے" اس کے اندر افسردگی اتر آئی۔
"جی" اس کے صبیح چہرے پر ایک تاریک سایہ سا لہرایا۔
"پھر۔ پھر کیا ہوگا؟"
"پھر!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور قلم رکھ دیا۔ "پھر ماسٹر جی۔ آپ آئیں گے تو سہی لیکن مجھے تو میری بہنوں کو پڑھانے کے لیے۔ اور میں پھر پردے کے پیچھے چھپ کر آپ کی آواز سنا کروں گی۔"
"تمہیں افسوس ہوگا۔"
"بالکل ہوگا جی" وہ افسردگی سے بولی۔
"کس بات کا؟"
سوہنی نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر فوراً ہی جھکا لی۔
"بولو نا سوہنی۔ کس بات کا افسوس ہوگا" اس نے بے تابی سے پوچھا۔
"افسوس ہوگا کہ بس بس اتنا سا ہی پڑھ پائی" وہ ناخن سے میز کی سطح کھرچنے لگی۔
"بس، بس سوہنی۔ اس ایک بات کا افسوس؟"
وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔
"بولو نا۔"
"اور۔ اور مجھے ان تینوں سے بڑی جلن، بڑا حسد محسوس ہوگا، جو آپ کو دیکھ سکیں گی۔ آپ سے ہنس بول سکیں گی۔ اور بس۔"
احسن نے گہرا سانس لیا۔
"تمہیں کسی دوسری لڑکی سے حسد اور جلن کیوں محسوس ہوتی ہے؟"
"جب کسی سے پیار ہو جاتا ہے" وہ اچانک بولی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔
احسن بے ساختہ مسکرا دیا۔
"تو تمہیں یہ دعویٰ ہے۔"
"اگر ہے بھی تو لاحاصل ہے" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"کیوں بھئی" وہ حیران ہوا "کیوں لاحاصل ہے۔"
"تمہاری خالہ نے مجھے خرید تھوڑا ہی ہے۔"
اس کے دل میں خوشی کی کلیاں کھل رہی تھیں۔ یہ خیال کس قدر خوش کن تھا کہ جس کے تصور نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں، وہ خود بھی جاگتی تھی اور اسے یاد کرتی تھی۔
نیند، آنکھوں سے بہت جس نے اڑا رکھی تھی
یہ ہوا کیا کہ ہوا اس کو بھی سونا مشکل!
"بولو سوہنی۔ کس بات سے ڈرتی ہو؟"

"آپ نے کہا تھا لڑکیوں کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔"
وہ دبی زبان سے بولی۔

"اوہ۔ اتنا کہا مانتی ہو میرا۔" وہ مسکرا دیا۔

"جن کو سب کچھ مانتے ہیں پھر ان کا کہا بھی مانتے ہیں۔" وہ خود بھی مسکرا دی۔

وہ لمحہ بڑا حسین تھا جب وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔ بڑی دیر تک خاموش بیٹھے وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔

اچانک دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہو گیا۔ احسن اور سوہنی دونوں ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے تھے، سفید کلف کے سوٹ میں آنے والا خود بھی کلف زدہ لگ رہا تھا۔ سانولی رنگت پر چمکتی سفید آنکھیں عجیب سرد مہری کا تاثر دے رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک کھڑا انہیں گھورتا رہا۔

"سوہنی۔" پھر وہ غرایا۔ "کون ہے یہ۔ کیا کر رہی ہے تو یہاں؟ باقی سب لوگ کہاں ہیں؟"

"مجھے احسن جلالی کہتے ہیں۔" وہ سنبھل کر بولا۔ "میں پڑھانے آتا ہوں ان لڑکیوں کو۔ ٹیچر ہوں ان کا۔"

"سوہنی کے لیے ٹیچر رکھ دیا ہے اماں نے؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔ "کیا بات ہے۔"

"نہیں چھوٹے سائیں۔ میرے لیے نہیں۔ بڑی بہنوں کے لیے۔" سوہنی کی حالت غیر تھی۔ "وہ سب لوگ بڑی حویلی گئے ہیں۔ چچا بچل کے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے اس لیے۔"

"ہوں۔" وہ سوچ کر بولا۔ "ٹھیک ہے ماسٹر! اب تم چھٹی کرو، سوہنی میں اوپر کمرے میں ہوں کھانا لے کر آ جانا۔ ذرا جلدی۔"

پھر اس نے ایک نگاہ غائرانہ احسن پر ڈالی اور مڑ کر باہر نکل گیا۔

"ہائے میرے رب!" سوہنی نے دل پکڑا اور صوفے پر ڈھے گئی۔

"سوہنی! کیا ہوا۔ خیریت تو ہے!" وہ پریشان ہو گیا۔

"اب کہاں خیریت۔ دیکھا نہیں آپ نے ماسٹر جی، چھوٹے سائیں تو سب کچھ کہہ دیں گے خالہ سے، یا اللہ میری کم نصیبی سے آپ پر کوئی مصیبت نہ آ جائے۔"

"یہ کون حضرت ہیں؟"

"یہ چھوٹے سائیں ہیں۔ بابا کے بہت قریبی دوست کے بیٹے۔ اماں نے اپنا بیٹا بنا رکھا ہے انہیں، بہت سخت مزاج ہیں اور۔۔۔ اور۔۔۔"

"اور۔۔۔؟"

"بہت۔۔۔ عیاش طبیعت کے بھی۔ مجھے ہمیشہ بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ یا خدا میری حفاظت کرنا۔ گھر پہ تو کوئی بھی نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"پھر۔۔۔ پھر سوہنی کیا کرو گی تم؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"آپ جائیں ماسٹر جی۔ خدا آپ کی حفاظت کرے گا۔ میں ماسی کو جگاتی ہوں۔"

"میں کل آؤں گا۔"

"نہیں نہیں اب نہیں۔ چھوٹے سائیں اب یہیں رہیں گے۔" وہ گھبرا گئی۔

"بے وقوف لڑکی! اب اگر میں نے آنا چھوڑا تو ہماری پوزیشن مزید خراب ہو جائے گی۔ سب یہی پوچھیں گے کہ چھوٹے سائیں کو دیکھ کر میں نے آنا کیوں چھوڑ دیا۔ اب تو سب کو بتانا ہی ہو گا کہ میں یہاں صرف اس غرض سے پڑھانے آتا ہوں۔"

"اچھا۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "اب آپ جائیں۔"

"جاتا ہوں تم ماسی کو ضرور جگا لینا۔"

"جی۔۔۔ بہتر۔"

"اور ہو سکے تو اسی سے کھانا بھجوا دینا تم اکیلی اوپر مت جانا۔" اسے کسی طرح تسلی نہ ہو رہی تھی۔

"جی!" وہ گلوگیر لہجہ میں بولی۔

احسن نے دروازے پر رک کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے وہ بت کی طرح ساکن کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"خدا حافظ سوہنی۔"

"خدا حافظ!" اس کے بھی لب ہلے۔

وہ افسردگی کو دل میں بھرے وہاں سے نکل آیا۔ گھر جانے کے بجائے نہر پر جا پہنچا۔ اور تادیر وہاں کھڑا پانی کی سطح پر سوہنی کی تصویر کو ابھرتے اور ڈوبتے دیکھتا رہا، اسے احساس ہوا کہ آج تک وہ خود کو کتنا

UrduPhoto.com

مجبور، کتنا لاچار، سمجھتا رہا تھا۔ اپنے مقدر سے شاکی رہتا تھا۔ اپنی زندگی کو ناکارہ اور غیر مفید سمجھتا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ دنیا میں وہ ایک اکیلا ہی اس طرح کا مقدر لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرح کے سینکڑوں تھے، جو اس کے آس پاس ہی آباد تھے، اور ان میں سے ایک سوہنی تھی، جو مرد بھی نہیں تھی، ایک کمزور بے بس لڑکی تھی۔

وہ سوچتا رہا اور کڑھتا رہا۔ چھوٹے سائیں کا بد فطرت وجود اور سوہنی کی معصوم صورت اس کی نگاہوں کے پردے پر پھیلتی سکڑتی رہی۔

"گھر پر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

کس درجہ لاچاری سے اس نے کہا تھا۔

"اور میں اسے اکیلا چھوڑ آیا۔ اس چھوٹے سائیں کے ساتھ۔" اس نے ٹھوکر سے مٹی اڑائی۔

"لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ کیا لگتا ہوں میں اس کا، مجھ سے زیادہ تو شاید وہ چھوٹا سائیں اس پر اپنا حق جما سکتا ہے۔"

کافی دیر وہ وہاں کھڑا کڑھتا رہا پھر شکستہ قدموں سے گھر لوٹ آیا۔

"نہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر میں ہارتا ہی رہا ہوں نامراد ہی رہا ہوں۔" اس نے بستر پر لیٹ کر سوچا۔ "لیکن اس بار نہیں۔ اگر میں زندگی میں کچھ بھی حاصل نہ کر سکا تو کیا ہوا۔ سوہنی، بس تمہیں نہیں کھوؤں گا، کبھی بھی نہیں۔"

دوسرے دن وہ بڑے اعتماد سے وہاں پہنچا تھا چھوٹے سائیں کے آنے کا سب سے پہلا اثر تو یہ ہوا تھا کہ بڑے گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ بغیر کسی لشتے کے بڑا مستعد اور چوکس سا۔

"سلام ماسٹر صاحب!"

"وعلیکم السلام۔"

"سب لوگ بڑی حویلی گئے ہیں صاحب۔"

"انشاء اللہ میں سروس بڑی کو ٹھیک ہے آپ کی۔" وہ مسکرایا۔

"جی؟ کیا کہا صاحب؟" اس کے خاک پلے نہ پڑا۔

"ارے بھائی۔ میں ان کو نہیں سوہنی بی بی کو پڑھانے آیا ہوں۔"

چوکیدار نے قدرے حیرانی و پریشانی سے اس کی صورت دیکھی۔ پھر اس کا پر اعتماد انداز دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔

وہ اندر پہنچ کر برآمدے میں ہی رک گیا، چند لمحوں میں سوہنی آگئی۔

"آپ۔۔۔ آپ آگئے!" وہ پریشان ہوگئی۔

"ہوں۔" اس نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور ۔۔۔ نم تھیں۔

"میرا خیال ہے اب آپ کو نہیں آنا چاہیے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو، چلو اندر چل کر بیٹھو۔"

دونوں گول کمرے میں آگئے۔

"چھوٹے سائیں کہاں ہیں؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اوپر۔ اپنے کمرے میں۔"

"تم روئی ہو؟ کیوں؟" اس کا دل بے چین ہونے لگا۔

"ماسٹر صا۔۔۔"

"کہا نا میں ہوں۔" اس نے ٹوک دیا۔ "اب تمہارے لبوں سے اپنا نام سننا چاہتا ہوں مجھے محسن کہو۔"

"نہیں ماسٹر صاحب!" اس نے سر نفی میں ہلایا۔ "اتنی عزت مت دیں مجھے۔"

"ایسا کیوں کہہ رہی ہو سوہنی۔ تم تو ہمیشہ سے قابل احترام ہو، لائق عزت ہو۔" وہ اس کی باتوں سے پریشان ہونے لگا۔

"میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ اب آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے۔"

"دیکھو سوہنی تمہارے چھوٹے سائیں نے خود اپنی آنکھوں سے ہمیں یہاں بیٹھے دیکھا ہے۔ اب ہمیں سچ بولنا ہوگا کہ تمہیں پڑھنے کا شوق تھا اس لیے میں باقاعدگی سے یہاں آکر تمہیں پڑھاتا رہا ہوں۔ دوسرے معنوں میں تو ہم مجرم بن جائیں گے کہ اگر ہمارے بیچ صرف پڑھنے اور پڑھانے کا رشتہ تھا تو چھوٹے سائیں کو دیکھ کر ہم نے یہ سلسلہ ختم کیوں کر دیا۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ طوفان کا سامنا تو اب ہمیں کرنا ہی ہے، لیکن

ہمارے کردار پر کوئی کیچڑ نہ اچھلے، یہ زیادہ بہتر ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

"اور اب یہ بتاؤ کہ تم اتنی پریشان کیوں ہو، تم روئی کیوں ہو، کیا چھوٹے سائیں نے کچھ کہا ہے؟"

وہ تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی پھر بولی۔

"چھوٹے سائیں، خالہ سے میرا ہاتھ مانگنے آئے ہیں۔"

"اوہ۔" وہ ساکت رہ گیا۔

"مبارک ہو۔" پھر وہ خود پر قابو پا کر پھیکے سے لہجے میں بولا۔

سوہنی نے ملامتی انداز میں اسے دیکھا۔

"کس بات کی مبارکباد دے رہے ہیں، ایک پنجرے سے نکل کر یقیناً زندگی کاٹنے کے لیے دوسرے پنجرے میں جانے کی۔"

"وہ بڑے آدمی ہیں، تمہیں پسند کرتے ہیں، بیاہ کر لے جا رہے ہیں، یقیناً خوش بھی رکھیں گے۔"

"جی، وہ بڑے آدمی ہیں۔ مجھے اب پسند کرتے ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی بہت سی لڑکیوں کو پسند کر چکے ہیں۔ ان میں سے تین کو بیاہ کر لے جا چکے ہیں، اب مجھے لے کر جائیں گے۔ یقیناً کچھ دن خوش بھی رکھیں گے پھر میں ہوں گی اور میرا سیاہ مقدر، چھوٹے سائیں کو ایک مقام پر رکنے کی عادت نہیں۔"

وہ استہزائیہ ہنسی تھی۔

"نہیں۔ نہیں سوہنی۔" وہ تڑپ اٹھا۔ "ایسا نہیں ہونا چاہیے، تم ایسی پیاری لڑکی اس سلوک کی مستحق نہیں۔ تم کسی کے چند روزہ بہلاوے کا سامان بنو، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیا کریں گے آپ؟" وہ بڑے دکھ سے بولی تھی۔

"اگر میں۔ میں بیگم صاحب سے تمہارا ہاتھ مانگوں تو۔؟"

وہ ہولے سے ہنس دی اور خاموش رہی۔

"بولو سوہنی۔"

"مجھ سے ایسا سوال کرتے ہیں جس کا جواب آپ خود جانتے ہیں۔ خالہ اپنے منہ بولے بیٹے پر ایک اجنبی شخص کو کیوں فوقیت دیں گی۔ اور میرا ہاتھ مانگ کر تو آپ خود بھی قابل شک ٹھہریں گے اور میں بھی، اور حلیمہ آپا، وہ تو مجھے جان سے مار دیں گی۔"

"لیکن ایسے کبھی تو خاموش نہیں رہا جا سکتا۔" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

سوہنی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن اسی لمحے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور چھوٹے سائیں نے اندر قدم رکھا۔

دونوں خاموش ہو کر کتابوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سوہنی کاپی پر آڑی ترچھی لائنیں کھینچنے لگی۔

چھوٹے سائیں نے چند لمحے اندر کا ماحول دیکھا پھر آ کر سکون سے ہی بڑے صوفے پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔ واضح طور پر وہ ان دونوں کو تنہا دیکھ کر مشکوک ہوا تھا۔

احسن نے تھوڑی دیر اسے پڑھایا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا سوہنی بی بی! آپ باقی کا کام کر لیجیے گا۔ میں کل آ کر چیک کر لوں گا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ احسن نے ایک تیز کڑی نگاہ کونے میں بیٹھے اس اوباش صفت شخص پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔

نجانے کیوں اس کا دل ساری دنیا کو تہس نہس کر دینے کو چاہ رہا تھا۔ اس کا وجود کتنا حقیر اور بے معنی تھا، درحقیقت آج اسے اس بات کا احساس ہوا تھا۔ وہ چھ فٹ کا لمبا چوڑا نوجوان کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ اس قابل بھی نہیں کہ کسی مظلوم، بے سہارا لڑکی کو حالات کے ظالم مگرمچھ کا نوالہ بننے سے بچا سکتا، اس کا ہاتھ طلب کر سکتا۔ اسے اپنا نام دے سکتا، بھلا کتنی اہمیت کا حامل تھا اس کا نام۔ غصے کی شدید لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

"اتنا غیر اہم، اتنا بے کار، اتنا بے مصرف۔" اس نے درخت کے تنے پر مکے برسا برسا کر اپنا ہاتھ زخمی کر لیا۔ "کیوں ہوں میں اس دنیا میں۔ کیا کرنے آیا ہوں۔" تقدیر کی ستم ظریفیوں پر اس کی آنکھ بھر آئی۔

پہلے تنہا اپنے دکھ جھیلتا تھا، اپنے زخم سہتا تھا، تو درد اتنا شدید نہ تھا۔ اب اس درد میں کسی اور کی آہیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ اور میں۔ میں اپنے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ تو اس کے لیے کیا کروں گا، ایک

بے روزگار، غریب نوجوان کیا دے سکتا ہے ایک لڑکی کو۔ جھوٹے وعدے، کمزور تسلیاں، جنہیں وہ اپنے پلو سے باندھ کر اس عیاش امیر کے ساتھ رخصت ہو جائے گی۔ زندگی بھر جلنے اور کڑھنے کے لیے۔ اور ایسے میں میرے تصور سے اسے کیسی کراہیت، کتنی نفرت محسوس ہوا کرے گی۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے، ایک مرد جب کسی مظلوم لڑکی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے تو کون سی خوشی بخش سکتا ہے اس کا تصور!"

ٹوٹے پھوٹے مجروح خیالات لیے، شکستہ دل سنبھالے وہ بوجھل قدموں سے گھر لوٹا تھا۔

دوسرے دن وہ حویلی پہنچا تو حلیمہ، سلیمہ اور شمیمہ اس کی منتظر تھیں۔ لیکن کچھ تناؤ زدہ چہروں کے ساتھ۔

"السلام علیکم۔ آگئیں آپ لوگ۔" اس کا بجھا ہوا دل مزید بجھ گیا۔ سوہنی کو نہ دیکھنے، اس سے نہ ملنے کا تصور کیسا جاں لیوا تھا۔

"جی ماسٹر صاحب۔" حلیمہ نے لب کشائی کی۔ "اور آپ کو اس بار نمبردار نے نہیں بتایا تھا کہ ہم نے آپ کو پندرہ دن چھٹی کے لیے [illegible] بلایا تھا۔"

"جی۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

نجانے سوہنی نے ان لوگوں سے کیا کہا ہوا تھا۔ ایسے میں اس کا کوئی بیان سوہنی کے لیے مزید پریشانی کا باعث بن سکتا تھا۔ اور اس کی پھر سے مار پڑنے کا سوچ کر وہ مزید خاموش ہو گیا۔

"دفع کریں ماسٹر صاحب! پریشان نہ ہوں۔" حلیمہ اسے پریشان دیکھ کر بولی۔ "وہ میسنی ہے ہی ایسی۔ آپ کی منتیں کی تھیں نا، اس نے کہ اسے پڑھا دیا کریں۔ سب بتا دیا ہے اس نے۔ کم بخت کو اتنا خیال نہ آیا کہ اماں سے پوچھ کر یہ حرکت کرتی۔ خیر آپ دل برا نہ کریں۔ آپ کا بھلا کیا قصور، آپ کا تو کام ہی پڑھانا ٹھہرا۔"

"اگر۔ انہیں بھی پڑھنے لکھنے کا اتنا شوق ہے تو آپ لوگ ساتھ بٹھا لیا کریں ان کو بھی۔" وہ قدرے محتاط لہجے میں بولا۔

"جی۔ اسے تھی پڑھانا لکھانا۔" سلیمہ نے نخوت سے ناک بھوں چڑھائی۔ "یہ بن ماں باپ کی لڑکیاں بڑی جلتی پہ رہ ہوتی ہیں۔ شکل سے معصوم، اندر سے پوری۔ پڑھ جائیں تو اور مصیبت کھڑی کرتی ہیں۔ اور ویسے بھی اماں نے اس کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ ذرا چاچا ساجد کے بیٹے کا چالیسواں ہو جائے تو اماں اس کا نکاح کر دیں گی۔ اچھا دیکھا بھالا لڑکا ہے، اپنے ہی گھر کا ہے۔"

اس نے خون کے کئی گھونٹ بھرے۔

"آپ۔ کیسے رہے اتنے دن ماسٹر صاحب؟" حلیمہ نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے تلخ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا گئی۔ "میرا مطلب ہے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی نا آپ کی۔"

"جی ہاں ٹھیک ہوں۔ شکریہ۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔ "اب آپ لوگ کتابیں کھولیں تو کچھ پڑھائی ہو جائے۔"

انہیں پڑھا کر، مزید کرنے کے لیے کام دے کر وہ سیدھا ہوا تو چائے کا کپ اس کے سامنے آگیا۔

"ماسٹر صاحب! چائے۔"

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ متورم آنکھیں سرخ ناک۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے دانتوں سے [illegible]

[illegible] سلیمہ [illegible]

آہستگی سے کہہ کر اس نے کپ تھاما اور پھر مڑ گیا۔ اس کی کلائی پر نیل پڑا ہوا تھا۔ واضح، لمبا اور گہرا نشان۔ آستین چڑھانے کے اندر بال کٹنے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ کوئی تھامے اور اسے کھینچتا ہوا اس جہنم کدے سے باہر لے جائے۔ لیکن ایسا کرنے کا کوئی حق اس کے پاس نہ تھا سو وہ چائے کا کپ تھام کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ہاں خود سے بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ گرم گرم چائے کے لمبے گھونٹ بھر کر اندر اتار لی اور جلتے ہوئے دل کو مزید جلا ڈالا۔ نجانے کیوں وہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی پھر آہستگی سے مڑ گئی۔

وہ انتہائی غصے کے عالم میں بیٹھا رہا، بات بے بات لڑکیوں کو ڈانٹتا رہا پھر بغیر کچھ کہے اٹھ کر باہر آگیا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی، اس کی جانب پشت کیے صحن کے پکے فرش کو گھور رہی تھی۔

"رات آٹھ بجے۔ ندی کے کنارے!" اس نے سرگوشی

UrduPhoto.com

کے سے عالم میں اس کے قریب سے گزرتے اس نے کہا اور آگے بڑھتا گیا۔

اسے کوئی امید نہ تھی کہ وہ آئے گی۔ بنجانے اسے کتنی آزادی تھی۔ تھی بھی یا نہیں۔ اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا تھا کہ اس کے سانس لینے پر بھی پابندی تھی۔ پھر بھی وہ ندی کے کنارے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔

دریا خان سے وہ کہہ آیا تھا کہ رات کو دیر سے لوٹے گا۔ اور دریا خان اس کی قنوطی طبیعت سے واقف تھا سو اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔

دس بجے کے قریب ایک ہیولا اندھیرے سے برآمد ہوا اور کسی نے ہولے سے پکارا۔

"ماسٹر صاحب۔"

"ہاں سوہنی۔ میں یہیں ہوں آجاؤ۔"

وہ بنا آواز کے اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"کیسی ہو سوہنی!" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے پر بالکل قادر نہ تھی۔

"تمہیں مارا ہے ان لوگوں نے؟"

"کوئی اور بات کریں۔ کیوں بلایا تھا آپ نے؟"

"چھپ کر آئی ہو؟"

وہ ہولے سے ہنس دی۔ اس طنزیہ ہنسی میں اس کے سوال کا جواب تھا۔

"اور اس وقت نکلتے ہوئے کوئی تمہیں دیکھ لیتا تو۔۔؟"

"یہ خیال آپ کو اس وقت آنا چاہیے تھا جب آپ نے ملنے کے لیے کہا تھا۔" وہ بولی۔ "میں نے تو کہا تھا نا کہ جب کسی کو سب کچھ مانتے ہیں، تو اس کی ہر بات مانتے ہیں۔"

"سوہنی۔۔ اور جب کسی کو سب کچھ مانتے ہیں نا تو اسے کسی مشکل میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی تکلیفوں پر دل تڑپ اٹھتا ہے اور سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔"

"مثلاً کیا کر سکتے ہیں آپ میرے لیے۔" وہ اداسی سے بولی۔

ہر چند کہ اس نے ایک سادا سا سوال ہی پوچھا تھا۔ لیکن احسن جیلانی کے لیے یہ ایک بہت بڑا طعنہ تھا۔ جو خود کو پہلے ہی کم مایہ سمجھتا ہو، اس کی قیمت پوچھ ملے تو یہی حال ہوتا ہے جو احسن جیلانی کا ہوا۔ وہ جیسے انگاروں پہ لوٹ گیا۔

"سوہنی۔ سوہنی میں شادی کروں گا تم سے۔ اپنا نام دوں گا، اپنی محبت دوں گا۔ اور تمہیں دینے کے لیے محبت میرے پاس واحد شے ہے۔ مجھے اس بات کا احساس دکھ ہے۔"

"مجھے آپ سے محض اسی شے کی آرزو ہے۔ باقی سب مٹی ہے، فانی ہے۔ لیکن ماسٹر صاحب! یہ ہونا ممکن بھی تو نہیں۔ کچھ دن بعد تو میرے نکاح کی تاریخ بھی طے ہو جائے گی۔ ہمارا ملنا تو ناممکن ہے۔ بنجانے میں کیوں چلی آئی۔"

وہ اٹھی مگر احسن نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں سوہنی! ایسے مت جاؤ۔ ابھی ہمیں بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ بہت سی منصوبہ بندیاں کرنی ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کرنا ہے۔"

"کون سی زندگی؟"

"جو ہم مل کر بسر کریں گے۔ ساتھ ساتھ۔"

"لیکن کس طرح؟" وہ زچ ہوئی۔

"یہی تو سوچنا ہے۔ تم بیٹھ جاؤ پلیز۔"

وہ کش مکش کا شکار تھی مگر بیٹھ گئی۔

"پہلے یہ بتاؤ۔ یہاں اگر دیر ہو گئی تو تم کسی مشکل کا شکار تو نہیں ہو جاؤ گی۔"

"میں نے چوکیدار کا آپ کو بتایا تھا کہ۔ وہ نشے کا عادی ہے۔ مجھے اس کی کوٹھڑی میں جا کر اس کا نشہ تلاش کرنے میں مشکل نہیں ہوئی۔ وہی پڑیا اس کے کھانے میں ملا دی ہے، وہ صبح تک اونگھتا رہے گا۔"

"ہوں۔ اب میری بات غور سے سنو۔" وہ بولا "سوہنی! میں تمہیں کسی اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔۔۔ میں ایک بالکل اکیلا، بے حد غریب آدمی ہوں، ماں باپ کب مرے، مجھے خود علم نہیں۔ بچپن سے خود کو اپنے ماموں کے گھر پایا۔ مامی مزاج کی تیز تھیں۔ انہیں میرا وہاں رہنا پسند نہ تھا۔ ماموں کے حالات بھی کچھ خاص نہیں تھے، بس سرکاری اسکولوں میں پڑھ پڑھ کر بڑا ہوا۔ تعلیم غیر معیاری تھی، سو اچھی نوکری بھی نہ مل سکی۔ دریا خان

UrduPhoto.com

نے تمہاری خالہ سے میرا ذکر کیا ہوا تھا۔ اس کے بلانے پر میں نے ماموں کا گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور یہاں چلا آیا۔ اب میرا تو آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ نوکری میرے پاس ہے نہیں۔ یہاں ٹیوشن پڑھا کر جو روپیہ جمع کیا ہے وہ ضرور میرے پاس ہے۔ لیکن وہ بھی ناکافی ہے ایک زندگی شروع کرنے کے لیے۔ تم بتاؤ ان حالات میں تم میرا ساتھ دینا چاہو گی یا نہیں۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو۔ تم پر کوئی زبردستی کوئی جبر نہیں۔ سوچنے کے لیے مہلت درکار ہو تب اس وقت تم واپس جا سکتی ہو۔ باقی بات کل یا پرسوں کر لیں گے۔"

"مجھے ایک لمحے کی مہلت بھی درکار نہیں۔ میں آپ کا ساتھ اپنی خوش نصیبی سمجھ کر قبول کر لوں گی۔ لیکن کس طرح؟"

"گھر چھوڑ کر چلو گی میرے ساتھ؟"

وہ بڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی پھر اس کی کپکپاتی آواز نکلی۔

"یعنی... یعنی... بھاگ کر؟"

"ہاں۔" وہ مستحکم لہجے میں بولا "ہمارے پاس دوسرا کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ ہم دونوں [illegible] جائیں تو کم از کم تمہاری ڈولی میرے لیے اس گھر سے نہیں نکلنے کی۔"

"لیکن ہم کہاں جائیں گے؟" اس کا مدافعتی لہجہ انتہائی کمزور تھا۔

"اللہ کی زمین بہت بڑی ہے سوہنی۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔ جہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ اپنی زندگی ہم کسی خوبصورت سی جگہ پر شروع کریں گے۔"

"اور... اور... اگر پکڑے گئے تو؟" اس نے تھوک نگلا۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو چکی تھی۔

"ہاں۔ یوں تو قسمت اب تک ایسی رہی ہے کہ آئندہ بھی کچھ زیادہ خوشگوار نظر نہیں آتی۔ لیکن آزما لینے میں کیا حرج ہے؟ کم از کم دلوں میں ملال تو نہ رہے گا کہ ہم نے کوشش ہی نہیں کی۔ پکڑے گئے تو قبریں ضرور برابر برابر بنیں گی۔"

وہ ہولے سے ہنسا۔

"ماسٹر صاحب!"

"بولو احسن۔!"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو مجھے خود پہ بھی بھروسا نہیں۔" اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ تم گھر جاؤ۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر تمہیں منظور ہوا تو ہم پرسوں اسی وقت یہیں ملیں گے۔ ورنہ میں سمجھ لوں گا کہ ایک مجبور لڑکی اپنے ہاتھوں میں بندھی زنجیریں اور پیروں میں پڑی بیڑیاں توڑنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اور اس میں اس لڑکی کا کوئی قصور نہ تھا۔"

وہ اٹھا اور سہارا دے کر اسے بھی اٹھایا۔

"چلو۔ میں تمہیں حویلی تک چھوڑ آؤں۔"

"نہیں ماسٹر جی۔ آپ جائیں۔ میں آئی بھی اکیلی تھی، واپس بھی اکیلی ہی جاؤں گی۔" آہستگی سے بازو چھڑا کر وہ رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

بیچ کے دو دن اس نے کس طرح سے کاٹے وہی جانتا تھا۔ سوہنی کو جھوٹے سایوں سے بچانے کی دھن اس کے دماغ میں بری طرح سما چکی تھی۔

تیسری رات وہ آٹھ بجے ہی یہاں چلا آیا۔ سردیاں اختتام پذیر ہو چکی تھیں اور فضا میں خوشگوار سی حدت محسوس ہوتی تھی۔

کافی دیر وہ غائب دماغی کی سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ آئے گی یا نہیں۔ وہ کوئی قیافہ لگانے سے بھی قاصر تھا۔ اپنی عزت اس طرح سے داؤ پر لگا دینا کسی بھی لڑکی کے لیے ایک بہت بڑا قدم ہو سکتا تھا۔

وہ اکیلا بیٹھا دنیا کے ہر مسئلے پر سوچتا رہا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی جب کوئی آہستگی سے اس کے برابر آ بیٹھا۔

"ماسٹر صاحب! میں آ گئی ہوں۔" سوہنی کی آواز تھی۔

اس نے ایک گہرا سانس چھوڑا۔

"شکر ہے۔ میں تو مایوس ہو چلا تھا۔"

"مجھے نہیں پتا میں ٹھیک کر رہی ہوں یا غلط۔"

"فیصلوں کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار عموماً وقت پر ہوتا ہے سوہنی۔" وہ بولا "ہم صرف اچھی امید رکھ سکتے ہیں۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟" وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"میری پوری بات سن لو پھر بولنا۔" اس نے رسانیت

نے کہا "سنو کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ نواب شاہ
میں میرا ایک دوست رہتا ہے میں اس کے پاس دو دن
رُکوں گا۔ ایسا میں اس لیے کر رہا ہوں تاکہ کسی کو بھی یہ
علم نہ ہو سکے کہ تم کس کے ساتھ گئی ہو، ورنہ ہماری تلاش
آسان ہو جائے گی۔ میں دو دن پہلے چلا جاؤں گا تو کسی
کو یہ خبر نہ ہو سکے گی کہ تم کہاں اور کس کے ساتھ گئی ہو۔
ہم دونوں ساتھ گئے ہیں، کوئی سوچ بھی نہ سکے گا۔
سمجھ رہی ہونا۔"

"جی۔"

"منگل کے دن تم صبح چار بجے والی گاڑی میں بیٹھو
گی۔ چار بجے اندھیرا ہوتا ہے، تم چوکیدار کو نشہ دے
دینا اور چادر میں لپٹ کر حویلی سے نکل آنا۔ اسٹیشن
یہاں سے دس منٹ کے راستے پر ہے۔ صبح کے وقت
پلیٹ فارم بالکل سنسان ہوتا ہے۔ تم گاڑی میں بیٹھ
جانا بنا کسی خوف کے۔ وہی گاڑی کچھ گھنٹوں بعد نواب شاہ
پہنچے گی۔ میں وہاں سے گاڑی پکڑ لوں گا اور ٹرین میں
تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔ ہم کراچی جائیں گے۔ نکاح کریں
گے اور وہیں کسی چھوٹے سے علاقے میں چھپ کر
کچھ عرصہ گزاریں گے۔ سمجھ گئیں؟"

"لیکن..." وہ خوف زدہ تھی۔ "اگر راستے میں ہم
نہ مل سکے تو؟ اگر میں کھو گئی تو؟"

"نہیں سوہنی۔ ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے یقین دلایا
"اس منصوبے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"اگر آپ گاڑی نہ پکڑ سکے ماسٹر صاحب، تو میں
کہاں جاؤں گی؟ مجھے تو نہ زمین پناہ دے گی نہ آسمان۔"

"جی چھوٹا نہ کرو سوہنی! ایسا ہرگز نہ کرنا محض
دریا خان کا خیال ہے۔ وہ میرا محسن ہے، میں اُسے
گاؤں بھر میں ذلیل کر کے نہیں جا سکتا۔ پلیز میری مجبوری
کو سمجھو سوہنی۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے ماسٹر صاحب۔"

"پھر تم یہاں آئی کیوں تھیں؟" اسے اچانک غصہ
آگیا۔ "اب بھی واپس جا سکتی ہو۔"

وہ خود بھی از حد نروس اور خوف زدہ تھا۔ ایسے
میں سوہنی کا خوف اس کے اعصاب کو مزید کمزور کر
رہا تھا لیکن جب اس کے ڈانٹنے پر وہ رونے لگی تو وہ
شرمندہ ہو گیا۔

وہ جب مرد ہو کر خوف زدہ تھا تو وہ تو پھر لڑکی
تھی۔ مزید یہ کہ گھر بھی اسے ہی چھوڑنا تھا، تو اس ڈر
کا خوف بھی اسے ہی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ سوہنی پلیز، چپ ہو جاؤ" اس
نے ندامت سے اسے پکارا "دیکھو میں معافی مانگتا
ہوں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

"ہمیں ڈر تو لگتا ہی ہے سوہنی لیکن جب ہم نئی
زندگی شروع کریں گے تو ہمیں یہ وقت یاد کر کے ہنسی
بھی آئے گی اور لطف بھی محسوس ہوگا۔"

اسے بہلانے کے لیے اس نے موضوع بدل دیا اور
نئی زندگی کا تصور سوہنی کے لیے پہلی بارش کی نرم
پھوار جیسا تھا، وہ کھل اٹھی۔

دونوں صبح کے آثار نمودار ہونے تک باتیں کرتے
رہے۔ سپنے دیکھتے رہے۔ تصور کی دنیا سجاتے سنوارتے
رہے۔

"اچھا سوہنی۔" پھر اس نے آسمان دیکھا اور کھڑا
ہو گیا۔ "خدا نے چاہا تو منگل کے دن ملیں گے ہاں اب
رخصتی ماسٹر جی!" اس کی آواز بھرا گئی۔ "خدا آپ
کا نگہبان ہو۔"

حویلی جا کر اس نے بیگم صاحب سے ملاقات کی
اور انہیں بتایا کہ وہ حیدر آباد جا رہا ہے۔ اسے وہاں
نوکری مل گئی ہے۔

"ماسٹر۔ اچانک کیسے؟" وہ پریشان ہو گئیں۔

"جی بس۔ اچانک لیٹر آگیا اس لیے۔"

"لیکن بچوں کا کوئی بندوبست تو کر جاتے۔"

"دیکھیے میرا ایک دوست ہے اسے بھیجوں گا، اگر وہ
راضی ہوا تو۔" اس نے مزید ایک جھوٹ بولا۔

"اچھا۔ تم جیسا تو نہیں پڑھائے گا وہ۔" وہ متذبذب
تھیں۔ "لڑکیاں خوش ہیں تم سے۔"

"وہ مجھ سے بھی اچھا پڑھائے گا۔ لڑکیاں اس سے
بھی خوش ہوں گی۔" وہ مسکرایا۔

"اچھا۔ جیسے تمہاری مرضی۔ اپنے دس دن کی تنخواہ
لے جانا۔"

اسے رد کرنے پر اصرار کرتا انہیں ویسے بھی اپنی توہین

لگا۔

حلیمہ، سلیمہ اور شمیمہ گھر پر نہیں تھیں۔ وہ جان بخشی ہونے پر خوش خوش چلا آیا۔

دریا خان کو وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ نواب شاہ جا رہا ہے سعد حسن کے پاس۔ کچھ دن وہاں رک کر وہ حیدر آباد چلا جائے گا۔

دریا خان عجب آدمی تھا۔ نہ زیادہ سوال کرتا تھا نہ بحث۔ "جیسی تمہاری مرضی" کہہ کر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ اسٹیشن پر اسے چھوڑنے آیا تھا۔

"یار! دل لگتا تھا تیرے ساتھ۔"

"ہاں۔ ٹھیک کہتا ہے تو۔ لیکن بس دریا۔ دل بھر گیا تھا ان خالی دماغوں سے الجھ الجھ کر۔ اب حیدر آباد جا کر کوئی ملازمت دیکھوں گا۔ مل ہی جائے گی۔"

"اپنا اتا پتا بھیجنا۔" وہ بولا۔ "یہ نہیں کہ بالکل بھول جا کر اپنے دھندوں میں گم ہو جاؤ۔"

"ارے نہیں یار۔ تجھے بھول سکتا ہوں بھلا۔"

"سعد حسن کو میرا سلام کہنا۔"

سعد ان دونوں کا مشترکہ دوست تھا۔

"ہاں۔ ضرور۔"

ٹرین آئی۔ چند منٹ کے لیے رکی اور وہ اس کے چلنے پر دریا خان سے گلے مل کر لپک کر سوار ہو گیا۔ اسے یقین تھا اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔

سعد اس کا بڑا اچھا دوست تھا۔ بڑی خوش دلی سے ملا۔

"بس یار۔ دو دن تنگ کروں گا تجھے۔ پھر نکل جاؤں گا نئی منزلوں کی جانب!"

"ارے میری جان! تو دو مہینے رہ لے۔ ہم یاروں کے یار ہیں۔" وہ ہنستا تھا۔

دو دن اس نے بڑے ہنس بول کر گزارے۔ وہ خود گاؤں سے نکل آیا تھا تو اب اسے سب کچھ بہت آسان لگ رہا تھا۔ بس اسے تو منگل کی صبح پہلی ٹرین پکڑنی تھی اور کراچی جیسے بڑے شہر میں گم ہونا کیا مشکل تھا۔ یوں بھی سوہنی جیسے غیر اہم وجود کی کس کی نظر میں اتنی اہمیت تھی کہ وہ اس کے لیے زیادہ چھان بین کرتا۔ ہاں چھوٹے صاحب کو جو بھی بیوی از سر نو ڈھونڈنے میں ذرا دقت پیش آئی۔

پیر کی شام وہ اپنا بیگ درست کر رہا تھا جب سعد کسی کو لیے اندر آیا۔

"لیجیے جناب۔ آپ کے بھی مہمان آگئے یعنی مہمانوں کے مہمان!"

وہ حیرانی سے مڑا۔ سامنے عبدالرحمن کھڑا تھا۔

"ارے عبدالرحمن، تم!" وہ اس سے لپٹ گیا۔

وہ اس کا جگری دوست تھا۔ اور ماموں کے ہاں سے چلتے وقت وہ اسی کو اپنا پتا دے کر آیا تھا۔

"بڑا خوار کیا ہے تم نے۔" وہ علیحدہ ہو کر شکایتاً بولا۔

"پہلے دریا کے گاؤں پہنچا، وہاں پتا کیا۔ علم ہوا جناب تو دو دن ہوئے رخصت بھی ہو چکے۔ یہاں اتنی مشکلوں سے سعد کا پتا کیا ہے۔"

"لیکن ایسی کیا افتاد آن پڑی؟" وہ ہنسا۔

"افتاد یہ کہ جناب میدان مار گئے ہیں آپ۔ سی ایس ایس پاس کر لیا ہے!"

الفاظ تھے کہ سحر پھونک دیا گیا تھا۔ احسن جیلانی ساکت کھڑا رہ گیا۔

"کل انٹرویو ہے۔ آج بہر حال ہمیں واپس چلنا ہے۔"

"جلدی سامان باندھو۔"

"لیکن۔ لیکن۔ عبدالرحمن۔" وہ جیسے کوما میں چلا گیا۔

"لیکن کیا میرے بھائی۔ حواسوں میں آجا۔" وہ اس کی حالت دیکھ کر ہنسا۔ "ابھی انٹرویو میں پاس ہونا باقی ہے۔ پھر ہم سیلوٹ ماریں گے آپ کو سی ایس پی آفیسر احسن جیلانی صاحب!"

اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ جیسے وہ سب سن رہا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

"یار احسن! تو ٹھیک تو ہے نا۔"

"عبدالرحمن۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اسے لے کر قریبی ہوٹل میں چلا آیا اور الف سے یے تک ساری داستان سنا ڈالی۔

"اب بتاؤ۔ کیا کروں؟ مستقبل قربان کر دوں؟"

عبدالرحمن سوچ میں پڑ گیا۔

"معاملہ انتہائی گڑبڑ ہے۔ تم قانون کے محافظ بننے جا رہے ہو اور دوسری جانب ایک بڑا جرم بھی کرنا چاہتے ہو۔ جانتے ہو لڑکی کو بھگا کر لے جانے کی سزا۔ کون کون

سے منفرد مات بن سکتے ہیں تم سے؟ پکڑے گئے تو کہیں کے نہ رہو گے۔ اور ان لڑکیوں کا تو کوئی دین ایمان نہیں ہوتا میرے بھائی۔ عدالت میں جا کر جھٹ بیان بدل دیتی ہیں۔ خود بچ کر صاف نکل جاتی ہیں۔"

"یار سب مجھے صحیح راستہ سمجھاؤ۔" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"صحیح راستہ یہ ہے کہ میرے ساتھ چلو۔ پندرہ منٹ بعد ٹرین نے آنا ہے، رات دیر سے کراچی پہنچیں گے اور صبح دس بجے تمہارا انٹرویو ہے۔ سوچ لو یہ کتنا بڑا چانس ہے لڑکیاں تو ایک چھوڑ ہزار ملتی ہیں، یہاں کامیاب ہو گئے تو زندگی کے سارے سپنے پورے ہو جائیں گے۔ عزت، طاقت کیا نہیں ہوگا تمہارے پاس۔ شادی کرنا کسی صوبائی وزیر کی بیٹی سے۔ یار لڑکی بھگا کر لے جائے گا یہ اسٹینڈرڈ ہے تیرا؟"

"لیکن۔ لیکن۔ اس کا کیا ہوگا؟" اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔

"کچھ نہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "نواب شاہ اسٹیشن پر تم اسے نہیں ملو گے وہ تمہیں ڈھونڈے گی اور ٹرین میں نہ پا کر اسٹیشن سے ٹرین بدل کر واپس اپنے گاؤں چلی جائے گی، کسی کھیت مزدور سے شادی کرے گی اور چھوٹے سائیں کی بیوی بن کر عیش کرے گی۔ دیکھو احسن! میں نے ہر پوائنٹ کلیئر کر دیا ہے۔ اب تم جو فیصلہ کرو، تمہاری مرضی۔ لیکن ذرا جلد، گاڑی نکلنے میں دس پندرہ منٹ ہیں۔ میں اسٹیشن جا رہا ہوں، تمہارا انتظار کروں گا۔"

اس کے جانے کے بعد وہ سانس روکے بیٹھا رہا۔ عبدالرحمن ٹھیک کہتا تھا۔ زندگی میں ملنے والا یہ پہلا اور شاید آخری چانس تھا۔ یہ وہ سنہری پنچھی تھا جسے چھونے کے لیے وہ ساری عمر تڑپتا رہا تھا۔ اس کے سپنوں کی تعبیر بن کر آج وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور احسن جیلانی اندر سے کمزور پڑتا جا رہا تھا۔

اسے سوہنی کا نام یاد، اس کا چہرا بھولتا جا رہا تھا۔ بنگلہ، گاڑی۔ باوردی نوکر، باوردی گارڈ اس کی آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔

"شادی کرنا کسی صوبائی وزیر کی بیٹی سے۔ یار لڑکی بھگا کر لے جائے گا یہ اسٹینڈرڈ ہے تیرا؟"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

ٹرین چلنے سے دو منٹ پہلے وہ اپنا بیگ لیے اسٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔

اے ایس پی بن کر وہ پنجاب آ گیا تھا۔ اور اس کی زندگی کی ندی اس طرح رواں ہوئی تھی کہ پچھلی یادوں کے پتھر کہیں اندر ہی اندر بیٹھتے چلے گئے تھے۔ اسے صرف آگے بڑھتے چلے جانا یاد رہ گیا تھا۔

سات سال بعد وہ ایس پی احسن جیلانی تھا۔ درنہ اس کی بیوی بن چکی تھی۔ اور وہ دو بچوں کا باپ تھا۔ معاشرے میں اس کا نام تھا، مقام تھا۔ اور اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو اس نے زندگی سے چاہا تھا۔ زندگی سے اپنے مقدر سے اسے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ حسن جیلانی جو بے کار تھا، غیر اہم تھا، بے نام، بے مقام تھا۔ یادوں کی وہ تصویر دفن ہو چکی تھی۔ اور اب جو کچھ وہ تھا اسے خود پر فخر تھا۔ وہ ایک حسین مہکتی رات تھی، ایک بڑے زمیندار کے بیٹے کی شادی کا جشن تھا۔ بڑے بڑے لوگ مدعو تھے، شراب کا دور کھلے عام چل رہا تھا۔ جام سے جام ٹکرا رہے تھے۔ آتش بازی اور فائرنگ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ موسیقی کا شور الگ مچا ہوا تھا۔ سامنے بنے اسٹیج پر رقص ہو رہا تھا۔

احسن جیلانی اپنے کسی دوست سے محو گفتگو تھا، قہقہے بکھر رہے تھے تب کسی نے بڑی آہستگی سے شراب کا جام اس کے آگے کر دیا۔

"ڈرنک لیجیے ایس پی صاحب۔"

اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی اور پھر اس کی نگاہ ساکت ہو گئی۔ وہ بدلی ضرور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ پہچان نہ پاتا۔ چست بھڑکیلا لباس زیب تن کیے چہرے کو شوخ رنگوں سے سجائے وہ جس انداز میں کھڑی تھی وہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کا تعلق کس جگہ سے ہے۔

"شکریہ۔" پھر وہ حواسوں میں لوٹا۔ "میں شراب نہیں پیتا۔"

"اوہ!" اس نے ہونٹ سکوڑے۔ "واقعی؟"

پھر وہ زور سے ہنس دی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ پھر ہنستے ہنستے وہاں سے ہٹ کر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔

UrduPhoto.com

"جانتے ہو اسے؟" اس کے دوست نے اسے ٹہوکا دیا۔

"نہیں! معلوم نہیں" اس کے لبوں سے نکلا بھی تھا یا نہیں۔

"مشہور طوائف ہے سوہنی۔ بڑا نام ہے یار۔ سنا ہے بڑی تیکھی ہے، تمہیں کیسے جانتی ہے؟"

"معلوم نہیں!" وہ خشک لہجے میں بولا۔

پھر وہ اٹھا اور اٹھ کر ایک قدرے پُرسکون گوشے میں جا بیٹھا۔ فضا خوشگوار تھی لیکن اس کا سارا وجود پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ سوہنی تھی! وہی سوہنی جسے وہ ان دیکھی، ادھ بنی راہوں کا مسافر بنا کر کہیں رستے میں ہی سونا چھوڑ آیا تھا۔ وہ سوہنی جو معصوم تھی! ان چھوئی تھی، جو چھوٹے سائیں کے گھر چلے آنے سے پریشان ہو جاتی تھی۔ اسے اب تک کتنے چھوٹے سائیں سے واسطہ پڑا ہو گا! ندامت کے سمندر میں اس کا پورا وجود غرق ہو گیا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اسٹیج پر تھی۔ نجانے کیوں اس پر ہنسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ ہنستی ہی چلی جا رہی تھی۔ احسن جیلانی نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔ چھت کو جاتی سیڑھیاں فی الوقت اس کی واحد راہِ فرار تھیں۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا اوپر چھت پر چلا آیا۔

وہ باتیں، وہ یادیں جنہیں اپنی دانست میں وہ قطعاً بھول چکا تھا۔ اب ہر جانب سے اس پر حملہ آور تھیں۔

"اگر ہم راستے میں نہ مل سکے تو۔ اگر میں کھو گئی تو؟"

وہ معصوم، خوف زدہ لہجہ۔

"مجھے ڈر لگتا ہے ماسٹر صاحب!" وہ اندیشے۔

آہ! سوہنی! تم کہاں نکل گئیں۔ تم لوٹ کر گھر کیوں نہیں گئیں۔ او میرے خدا! آگہی کا یہ عذاب اب کیوں نازل ہوا مجھ پر۔ اب ساری زندگی کراہوں گا۔

"یہ کیسا بوجھ آن پڑا ہے مجھ پر" ریلنگ تھامے وہ ہانپتا رہا۔

"کیوں ایس پی صاحب! منہ چھپا کر یہاں چلے آئے۔ ہم کیا کہہ رہے تھے بھلا آپ کو؟ ہاں؟"

اس کے پیچھے وہ لٹتے ہیں دھنتا کھڑی تھی۔

"سوہنی!"

"اوہ۔ نام یاد ہے آپ کو؟" وہ ہنسی۔ "ویری گڈ! یادداشت تو بڑی اچھی ہے آپ کی۔ بھلا کون سا اسٹیشن تھا جہاں ملنا تھا ہمیں؟"

"سوہنی۔ تم۔ یہ تم کس رستے پر چل دیں!" وہ انتہائی دکھ کے عالم میں تھا۔

"اب پوچھتے ہو مجھ سے" وہ اچانک چلائی۔ "اب پوچھتے ہو۔ اب جب میں نیلام ہو گئی، بک چکی۔ میری عزت، میری معصومیت خاک میں مل چکی۔ تو اب مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ جاؤ ایس پی صاحب جا کر آئینہ دیکھو۔ تمہارے چہرے کی سیاہیوں میں تمہارے ہر سوال کا جواب ہے۔"

"سوہنی۔ بخدا میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔" وہ گڑگڑایا۔

"میں نے بھی ایسا نہیں چاہا تھا۔" وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "میں نے بھی ہمیشہ دعا کی تھی کہ میں کبھی تمہیں نہ دیکھوں، دعا کی تھی میں نے کہ تم زندہ نہ بچے ہو۔ تم اپنا وعدہ نبھانے سے پہلے کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو۔"

ابن انشاء کے سفرناموں کے سلسلے کا نیا سفرنامہ

نگری نگری پھرا مسافر

ابن انشاء کے سفرناموں کے سلسلے کا آخری سفرنامہ ہے جو جولائی ۱۹۸۹ء میں پہلی بار چھپ کر تیار ہوا ہے اس سفرنامہ میں جاپان، روس اور لندن کے سفر کا احوال درج ہے۔

یہ کتاب خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گئی ہے اور مشہور کارٹونسٹ نجمی نے کارٹون بنائے ہیں۔

قیمت ۵۰ روپے

اس پتے پر خط لکھیں یا قریبی بک اسٹال سے خرید لیں۔

لاہور اکیڈمی ۵-۳ سرکلر روڈ، لاہور

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۳۷ اردو بازار کراچی

دعا کی تھی میں نے کہ زندگی کے کسی موڑ پر مجھے یہ علم نہ ہو کہ مجھے دھوکا دیا گیا۔ میں نے بہت دعا کی تھی۔"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"لیکن — ہم سیاہ نصیب کیا۔ اور ہماری دعائیں کیا۔ تم زندہ ہو۔ اور میں تمہاری فریب کاریوں کی عبرت ناک نشانی ہوں۔"

"سوہنی! مجھے معاف کر دو۔ دیکھو میں اب بھی اپنانے کو تیار ہوں تمہیں۔ میں شادی کر سکتا ہوں تم سے۔ دنیا سے چھپا کر ہم —"

"تھو۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے نفرت سے تھوک دیا۔

"چھپ کر طوائف بننے سے کھلے عام طوائف کہلانا مجھے زیادہ منظور ہے۔ تم سے کہیں بہتر تو چھوٹے بیاہی تھے۔ تمہاری دوسری بیوی بننے سے ان کی چوتھی بیوی بننا کہیں اچھا تھا۔"

"میں مجرم ہوں تمہارا۔ جو چاہو سزا سنا دو۔"

"ہاہ — سزا۔" وہ زور سے ہنسی۔ "ارے ایس پی صاحب اتنے پڑھے لکھے آدمی ہیں آپ ہم گنوار، بے پڑھے لکھے لوگ کیا سزا سنا سکتے ہیں آپ کو۔ دنیا آپ کی، کامیابیاں آپ کی، عدالتیں آپ کی، ہماری آپ کا کیا ... خدا رہ جاتا ہے، اور در حقیقت وہی اصل سہارا ہے اور — اور سزا تمہیں اس دنیا میں ملے؟ نہیں نہیں، ایس پی صاحب سرکار — میں نے اگر زندگی میں کبھی کوئی اچھا عمل کیا ہے تو اس کی جزا میں خدا سے صرف ایک ہی مانگوں گی، یوم حشر کے دن تمہارا گریبان۔

یہاں اس دنیا میں، میں تم سے اپنی معصومیت، اپنی سادگی، اپنی عزت کا خون بہا طلب نہیں کروں گی ایس پی احسن جیلانی صاحب! اور نہ ہی آپ سے معاف کروں گی۔

میں اسے وصول کروں گی، لیکن یہاں نہیں بلکہ اس جگہ جہاں ایک دن ہر ظالم اپنے مظلوم کے روبرو جوابدہ ہوگا۔"

"سوہنی، اتنی بڑی بد دعا۔" وہ گڑگڑایا۔

"میرے دل سے پوچھو۔" اس نے درد کی شدت سے آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ "کیسا درد اٹھا ہے اس میں۔ تمہیں دیکھ کر، تمہیں زندہ پا کر، تمہیں بے غیرتی سے جیتا دیکھ کر۔ ایک حسین دنیا کا خواب دکھا کر کس جہنم میں پہنچا یا ہے تم نے مجھے۔ کیا گزرا تھا میں نے تمہارا ایس پی صاحب۔ میں سمجھتی تھی تم نے سچ مچ چاہا تھا مجھے۔ میں سمجھتی رہی۔ تم زندہ ہوتے تو دنیا میں کسی جگہ بھی ہوتے، اپنا وعدہ نبھانے ضرور پہنچتے۔ میں سمجھتی رہی۔ تم جان سے گزر گئے ہو میں بے آبرو ہوئی، لیکن تم، تم تو زندہ ہو۔ تم تو زندہ ہو۔"

وہ تکرار کرتی آگے بڑھی، ریلنگ سے ٹکرائی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، وہ ایک جھٹکے سے نیچے جا گری۔

"سوہنی۔" وہ بڑے زور سے چلایا تھا۔

صبح کی سفیدی سارے میں پھیل چکی تھی اور سفید دھواں سا ان کے اندر بھی بھر رہا تھا۔

"احسن!" حوریہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"آپ سوئے نہیں نا؟"

وہ آہستگی سے مڑے۔

"دلوں کی سیاہیوں کے عذاب اکثر پلکوں پر آ ٹھہرتے ہیں ..."

"چلیے۔ ذرا دیر سو جائیں۔" وہ نیند میں اس کی بات قطعاً نہ سمجھیں۔

"نہیں۔ میں جاگنگ کرنے نکلوں گا۔"

وہ شانے پر رکھا حوریہ کا ہاتھ نرمی سے ہٹا کر باہر نکل گئے۔

صبح ہر طرف پھیل رہی تھی، اور احسن جیلانی پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

UrduPhoto.com